صحرا میں کنول
سید نور حسین شاہ
PDFBOOKSFREE.PK

درجہاں مثل چراغ لالہ صحرا ستم
نے نصیب محفل نے قسمت کاشانہ

(علامہ اقبال)

نور حسین شاہ دیارِ غیر میں بیٹھ کر جس جانفشانی سے گلستان ادب کی آبیاری کر رہے ہیں اس کے لئے وہ یقیناً ہم سب کی طرف سے تحسین کے مستحق ہیں۔ وہ ایک نہایت حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ اور ان کی تمام تخلیقات اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کا نیا ناول "کنول کھلا صحرا میں" معاشرے میں بکھری ہوئی بے انصافیوں' عدم مساوات اور انسانی مجبوریوں کی ایک المناک داستان ہے۔ نور حسین شاہ کے دردمند قلم نے اس داستان میں گہری جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ اس ناول میں قدم قدم پر قاری کی دلچسپی کا سامان موجود ہے وہ یوں کہ اس ناول کا مرکزی کردار معاشرے اور قسمت کے ہاتھوں ستائے ہوئے مجبور لوگوں کی ایک علامت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کے اس آئینے میں بہت سے دکھی لوگ اپنی صورت پہچان لیں گے اور دل و جان سے اس کی پذیرائی کریں گے۔

شبنم شکیل

ایف۔۳/۷ اسلام آباد

تاثرات

باسمہ سبحانہ

آپ تو شاہ جی کی سیماب صفت زود نویسی پہ چونکے ہوں گے کہ ۹۱ء میں "مورد الزام آدم زادی" ۹۲ء میں "گہن لگا چاند" اور اب ۹۳ء میں "صحرا میں کنول" یعنی ہر نئے سال کی آمد پر ایک تخلیق کی آورد۔۔۔ اور وہ بھی سید نور حسین شاہ کے خامہ برق رفتار سے۔ کہ شب و روز کی بے پناہ مصروفیات کے باعث شاید ہی چند ثانئے شاہ جی کو پئے ترقیم و تحریر میسر آتے ہوں گے۔۔۔ اور مستزاد یہ کہ۔

ہر گلے لا رنگ و بوئے دیگر است

لیکن مجھے چونکایا ہے ناول کے عنوان "صحرا میں کنول" نے

کچھ ایسی ہی کیفیت سے برسوں پہلے بھی دوچار ہونا پڑا یہ دوران مطالعہ دیوان غالب یہ شعر۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

نظر سے گزرا۔ تب میں چونکا ہی نہیں تھا بلکہ سٹپٹا اٹھا تھا اور بہت دنوں تلملایا۔ ہم عصر طلاب کی طرح میرا بھی عقیدہ بن گیا کہ محال عقلی مضمون باندھ کر مرزا دانستہ اپنے قاری کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جھنجھلاہٹ کے عالم میں خلد آشیانی والد صاحب (ملک حبیب احمد بن ملک عبدالرحمٰن جالندھری نور اللہ مرقدہ مدفون جنت المعلیٰ مکہ المکرمہ) سے رجوع کیا۔ پدرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ ہمدردی و ترحم کی جھلک آنکھوں میں نمایاں تھی۔ فرمایا "میاں! چوتھی پانچویں غزل پہ ہی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جب۔

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

پر پہنچو گے تو شاید غالب کے پرزے اڑانے والوں کی صف میں شامل ہو جاؤ گے۔ اور پھر جو اپنے مخصوص انداز میں "عدم سے بھی پرے" کی گتھی سلجھائی۔ غلو' اغراق کا نکتہ سمجھایا۔ منطقی نکتہ نظر سے اجتماع نقیضین' ارتفاع نقیضین' محال عقلی' محال عادی اور معدوم و موجود کی عقدہ کشائی فرمائی۔ تو فرط عقیدت سے نگاہیں پابوسی کے لئے جھک گئیں۔

برسوں بعد جب اگلے روز شاہ جی سے ناول کے عنوان پہ گفت و شنید ہوئی تو لگا کہ گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹ گئی ہے۔ میرے اندیشہ محال عادی کی رو میں شاہ جی نے نہ صرف یہ وضاحت فرمائی کہ عنوان کی عمارت استفہام کی اساس پہ کھڑی ہے۔ بلکہ انسان کے مجبور محض و ضعیف البنیان ہونے کے بارے میں ایسا مدلل موقف اختیار کیا کہ میں ان کی ادبی بصیرت اور دینی بصارت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا اور جب اپنے موقف کے اثبات میں

بسلسلہ جبر و قدر یہ برہان لائے کہ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ

تو خانوادہ سادات کے اس چشم و چراغ کی عالی فکر اور وسعت مطالعہ نے میرے دل پر اک گہرا نقش ثبت کر دیا۔

شاہ جی کی تصنیفات دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ خود اپنی ذات' گرد و پیش کا مشاہدہ' کڑوے میٹھے تجربات اور تخیل و مطالعہ سے انہیں مواد فراہم ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنے تجربات نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ یادداشت محفوظ رکھتے ہیں اور صبر' آزمائش' ضبط و تحمل اور کاوشوں کے بعد قاری کے لئے ایک نئی تخلیق کرتے ہیں۔ دنیا تو شاہ جی کی بھی وہی ہے۔ جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں مگر اپنے لچک دار اور زرخیز تخیل سے معمولی سی بات کو بھی اس طرح رنگین بنا دیتے ہیں کہ ہماری دیکھی ہوئی دنیا بالکل نئی بن کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اس پرانی دنیا کو نئی بنانے کے لئے۔ اس کی فرسودگی میں تازگی پیدا کرنے کے لئے وہ تجربات کے سمندر میں غوطے لگا کر اس کی تہہ سے' دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ پھیلا کر بہت سی چیزیں چن لیتے ہیں اور پھر ان چنی ہوئی چیزوں سے ان کی نظر انتخاب کچھ

جواہر ریزے نکال لیتی ہے۔ اور ان جواہر ریزوں کو ان کا توانا تخیل زندگی کی نئی آب و تاب دے کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب وہی زندگی جو ہماری دیکھی بھالی ہے۔ جسے ہم نے برابر برتا ہے بالکل نئی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ اور اس نئی دنیا میں شاہ جی کا تخیل۔ ان کے جذبات اور زندگی بھر کے تجربات کچھ ایسے رنگ شامل کر دیتے ہیں کہ جو زندگی میں اس سے پہلے بکھرے ہوئے تھے مگر اب قوس و قزح کی رنگینی لے کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ادب گو خود زندگی نہیں۔ مگر اس نے زندگی کو کچھ یوں اپنے دامن میں سمیٹا ہے کہ وہ زندگی کا دوسرا نام بن گیا ہے۔ زندگی کے بعد اگر کوئی اور چیز زندگی ہے تو وہ ادب ہے۔ زندگی کی سب سے قریبی مماثلت دیکھ کر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب نے ان کی زندگی سے ایک ہمیشہ استوار رہنے والا اور نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کر لیا ہے۔ اس رشتے کی نوعیت البتہ ان کی آئندہ تصنیفات کے بعد بالکل واضح نظر آئے گی۔

ایک چابک دست ناول نگار کی طرح شاہ جی نے اس ناول کے مختلف کرداروں میں ایک ایسی ترتیب۔ ایسا ربط' ایسا تعلق اور ایسا رشتہ قائم کر دیا ہے کہ جو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے ہر لحاظ سے قابل قبول ہے۔

ہر حصہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مربوط ہے کہ جیسے دنیاوی زندگی کے اسباب و نتائج۔ ایک حصہ دوسرے کا نتیجہ اور دوسرے کی تخلیق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سب حصوں کے باہم ہم آہنگ ہونے کے باوجود مختلف حصے میں اپنی علیحدہ علیحدہ حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ شاہ جی نے خوب صورت فنی ترتیب سے کہانی کو ایک منظم' مربوط اور موثر و دلنشین وحدت میں بدل دیا ہے۔

اسلوب بیان سے متعلق کسی رائے زنی سے عموماً گریز ہی میری فطرت ہے کیونکہ۔

ماقصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

البتہ اس نکتہ نظر کا قائل ضرور ہوں کہ اسلوب بیان کسی مصنف کا وہ طرز تحریر ہے جو اسی مصنف کے ساتھ مخصوص ہو اور اس کی تحریر کی امتیازی خصوصیات کا حامل ہو۔

شاہ جی آراستہ و پیراستہ زبان کے بجائے البتہ بات صاف صاف و سادہ سادہ پیرایہ میں کہہ جاتے ہیں۔ تصنع و بناوٹ کے بجائے ان کی انشاء پردازی سننے والے کو فوراً سمجھ آجاتی ہے۔ مضامین سچائی و خلوص پہ اس طرح مبنی ہوتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ نور حسین شاہ کے دل میں ہے وہی صفحہ قرطاس پر منعکس ہو گیا ہے۔

خیالات کے اظہار میں کسی خاص مکتب فکر کی تقلید بھی نہیں کرتے کوئی خاص نظام الفاظ یا فقروں اور ترکیبوں کے انتخاب میں کوئی مخصوص اصول قائم کرنے کے بجائے یا لفظوں کی خوبصورتی' فقروں کی ہم آہنگی اور صرف کی باریکیوں سے پنجہ آزما ہونے کے بجائے سادگی' بے تکلفی اور روانی کا انداز اپنا کر تحریر کو ہمہ رنگ خیالات ادا کرنے کے قابل بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حشمت کا مرکزی کردار قاری کے ذہن پر ایک ایسا پر حزن تاثر چھوڑ دیتا ہے اقلیم سخن کے بے تاج و پابرہنہ شہنشاہ کا شعر یاد آگیا۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

میرا گمان ہے کہ سید نور حسین شاہ کا یہ ناول غالباً مرحوم ساغر سائیں کے محررہ بالا شعر کی تفسیر ہے۔

سید نور حسین شاہ کا تعلق مغربی پنجاب کے اس مردم خیز ڈویژن سے ہے کہ جس کی مٹی کو ہمیشہ یہ ناز رہے گا کہ اس نے میاں محمد بخش' سید مہر علی شاہ' پیر فضل شاہ' حضرت جوگی جہلمی اور سید ضمیر جعفری کے علاوہ دیگر بہت سے صاحبان قلم و کمال کو جنم دیا۔ اور اہالیان دودھ کے لئے بھی یہ امر انتہائی مسرت فزا ہے کہ نور سادات کی ایک کرن سید نور حسین شاہ کے روپ میں عرب کے ریگزاروں کو اپنی ضیاپاشیوں سے منور کر رہی ہے۔

چہرے پہ من من مسکراہٹ سجائے رکھنے والے "شاہ جی" یہ کہنے میں ہر طرح سے حق بجانب ہیں کہ ؎

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی بسر تو کر

(محسن)

ابن الحبیب احقر
بانی مجلس فروغ اردو
دوحہ' قطر

معروضات مصنف

تدبیر کنند بندہ تقدیر کند خندہ

اوپر والا جو کچھ تقدیر میں لکھ دیتا ہے۔ وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ تقدیر کا لکھا کبھی ٹل نہیں سکتا۔ انسان تدبیریں کرتا ہے۔ اپنی قسمت سنوارنے کے لئے حتی المقدور مساعی کرتا ہے لیکن مقدر اس پر قہقہے لگا رہا ہوتا ہے۔

میرے معاشرتی ناول کا ہیرو حشمت اس مثل بے مثال کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ وہ ایک غریب خاندان میں جنم لیتا ہے۔ وہ نہایت خوب صورت ہوتا ہے۔ سمجھ لیں گلاب کا پھول' لیکن اس کا گردوپیش گلاب کے بجائے کنول جیسا ہوتا ہے۔ جہاں بوباس کے بجائے بو کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اس کا مسکن بھی دوسرے غربا کی مانند محل کے بجائے جھونپڑی نما مکان ہوتا ہے۔ وہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو اپنی ذہانت' فطانت ولیاقت کا جھنڈا اسکول میں گاڑ دیتا ہے اور اساتذہ کرام کے دلوں میں رچ بس جاتا ہے۔

افوہ۔ زمانے کے دستور کے مطابق اس کے ساتھ بھی ویسے ہی ہوتا ہے جیسے دوسرے غریبوں کے لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرپاتے۔

وہ بھی ظلمی دنیا کی چکی کے دوپاٹوں میں پس جاتا ہے اور بارہویں جماعت کا سالانہ امتحان بھی نہیں دے پاتا۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی قسمت میں لکھا نہیں ہوتا کہ وہ اعلیٰ زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر بڑا آدمی بنے۔

بڑے آدمی تو بڑے آدمیوں کے چشم و چراغ بنتے ہیں۔ وہی امتحانوں میں میرٹ حاصل کرتے ہیں۔ وہی سی ایس ایس اور دیگر اعلیٰ امتحانات پاس کرکے اعلیٰ عہدوں پر متمکن ہوتے ہیں۔ وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر جو پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال مند ہوتے ہیں برگشتہ بختوں پر راج کرتے ہیں۔

روز ازل سے امراء مسند اسلاف پر براجمان ہوتے آرہے ہیں تو پھر حشمت کیسے رسومات جہاں کی زنجیروں کو توڑ کر چمکتے دمکتے سنگھاسن پر رونق افروز ہو کر اپنی قسمت سدھار سکتا تھا۔

جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ کے مصداق اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونا تو امراء وحکام کے جگرپاروں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ جو نسل در نسل چلتا آتا ہے۔ جبکہ غریبوں اور مسکینوں کا کام تو محنت مزدوری اور حکمرانوں کی غلامی کرنا ہوتا ہے۔

دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے۔ جو دانہ پانی حشمت کی قسمت میں لکھا تھا۔ وہ اسے مل رہا تھا۔ جب اس کی سوچ کے مطابق اس کے نصیب زیادہ برے ہو گئے۔ اس کے اپنے غیر بن گئے اور ان کے خون سفید ہو گئے تو اس کے لئے اپنی سوہنی دھرتی پر رہنا محال ہو گیا تو اس ن ملک کو خیرباد کہا اور اپنی قسمت سنوارنے غیر دیس میں آگیا۔ وہاں اس کے دانا پانی میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا۔ اس کے گلستان زیست میں بہار آگئی۔ نہ صرف رت بسنت آئی بلکہ اسے زاہدہ کے روپ میں گلشن آراء مل گئی۔ جس سے اس کی زندگی میں قوس وقزح کے رنگ بکھر گئے۔

اس کا کنول کھل اٹھا۔ وہ مسرور تھا کہ ایک پژمردہ کنول صحرا میں آکر کھل گیا۔ اور اس نے اپنے زور بازو سے اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگا لیا۔

لیکن اس کی سوچ ایک بھول تھی' خام خیال تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سیاہ قسمت کو زاہدہ نے اپنے اچھے نصیبوں سے دمکا دچمکا دیا تھا۔ اس کے قالب پر اپنی قسمت کا ملمع چڑھا دیا تھا اور وہ زاہدہ کی قسمت پر عیش و عشرت کر رہا تھا نہ کہ اپنی قسمت کے طفیل۔

جب اس پر عنصر حقیقی کا ملمع کھلا تو اس نے برملا لیکن دل کو چیر کر اپنی صابر گرہستن سے کہا۔

"جو کچھ لوح محفوظ پر لکھا ہوتا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی بھی ہستی نہ مٹا سکتی ہے اور نہ اس کے کسی حرف کو تبدیل کر سکتی ہے......

میں ناداں سمجھ بیٹھا تھا کہ صحرا میں کنول آکر کھل گیا ہے۔ بھلا کبھی کنول صحرا میں کھلا

ہے۔ کبھی بدنصیب کے نصیب بھی جاگے ہیں۔ کبھی غریب بھی امارت کے اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر اونچی اڑان اڑا ہے؟

تو پھر میں کیسے کھل سکتا تھا۔ میرے آنگن میں تو زاہدہ کے نصیبوں کی شمع روشن تھی جس سے میرے ذہن و قلب میں دھنک کے رنگ بکھرے تھے۔"

وہ جان چکا تھا کہ کنول کبھی بھی گلاب کا پھول نہیں بن سکتا۔ اور نہ ہی صحرا میں کنول کھل سکتا ہے تو وہ اپنے ہی آنسوؤں کے گلدان میں کملا گیا۔ وہ گریہ زاری کرتا جہاں آب و گل میں آیا تھا اور بین کرتا دنیائے حقیقت کی طرف سدھار گیا۔

قارئین کرام یہ تو تھا میرے ناول کا عطر۔ اب میں پاکستان کی معروف شاعرہ اور افسانہ نگار جن کا مجموعہ کلام "شب زاد" اور افسانوں کا مجموعہ "نہ قفس نہ آشیانہ" منظر عام پر آچکا ہے اور دوسرا مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے۔ کی نذر گلہائے تشکر و عقیدت کرنا چاہتا ہوں کہ جنہوں نے میرے ناول پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کر کے میرے دل میں مسرتوں کے چراغ جلائے۔

میں اپنے مخلص دوست ابن الحبیب احقربانی مجلس فروغ اردو دوحہ قطر کا بھی دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں کہ جنہوں نے اپنے قیمتی تاثرات سے میری کاوش کو سراہا۔

میں صاحب دیوان جناب محمد ممتاز راشد کا بھی ممنون ہوں کہ جنہوں نے قطر کی تاریخ کے بارے میں مفید مشوروں سے نوازا۔

میں جناب ایم اے شاہد جنرل منیجر الفردان ایکسچینج اینڈ فنانس کمپنی۔ جناب سید جواد حسین جنرل منیجر پی آئی اے قطر' جناب راشد سلیم اسسٹنٹ جنرل منیجر قطر اسلامی بینک' جناب خالد چغتائی منیجر دوحہ بینک۔ جناب عبدالحمید ایگزیکٹو ڈائریکٹر موسسہ المفتاح' جناب حسیب الرحمٰن انجینئر' جناب فیض شاہد چیف اکاؤنٹنٹ کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ جنہوں نے میرے ناول "دگہن لگا چاند" کے منصہ شہود پر آنے پر مجھے مالی و اخلاقی تعاون سے نواز کر میرا حوصلہ بڑھا دیا۔

میں قطر فرٹیلائزر کمپنی کے جنرل منیجر السید فیصل السویدی اور فنانس منیجر السید علی مبارک

کا ممنون و ممدوح ہوں کہ جنہوں نے مجھے قیمتی انعامات سے نواز کر میرے قلب میں فرحت و طمانیت کا مصباح فیروزاں کیا۔

آخر میں میں اپنے زیر نظر ناول کے مرکزی کردار پر مختصر منظوم کلام پیش کرتا ہوں امید ہے قارئین کرام پسند فرمائیں گے۔

میں نے ناول نگاری میں ایک اچھوتا تجربہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ میں نے نونہالان کی دلچسپی کے لئے اپنے ناول میں ان کے لئے تعمیری اور معیاری کہانیاں اور بجھاؤتیں بھی تحریر کی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ نوعمرد سان چمن پاکستان میری کاوش کو پسند فرمائیں اور سراہیں گے۔ اس کے لئے انہیں ناول کا دوسرا حصہ کنول (بچوں کا ناول) پڑھنا پڑے گا۔

آخر میں میں اپنے زیر نظر ناول کے مرکزی کردار پر مختصر منظوم کلام پیش کرتا ہوں امید ہے قارئین کرام پسند فرمائیں گے۔

میں ایک مہکتا غنچہ تھا۔ جب مالی میرا زندہ تھا (جب ماں زندہ تھی)

جب من کا پھول مہکتا تھا۔ میں چہک چہک کر کھلتا تھا
اترا اترا کر چلتا تھا۔ جب بچپن کا شہزادہ تھا
میں بے غم ہوکر سوتا تھا۔ جب سر پر ماں کا سایہ تھا
شربت لوری کا پیتا تھا۔ جب چشمہ شفقت بہتا تھا
لہرا لہرا کر کھاتا تھا۔ جب لنگر فیض کا بٹتا تھا
جب سورج مٹی میں ڈوبا (ماں مرگئی)۔ خوشیوں کا چاند بھی گہنایا
پھر نگری نگری بھٹکا تھا۔ اور پتھر ٹھوکر کھاتا تھا
پھر جیتا تھا نہ مرتا تھا۔ میں گرتا اور سنبھلتا تھا
سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ دل زخمی پنچھی جیسا تھا

اب بھی افسردہ رہتا ہوں۔ یادوں کے نشتر سہتا ہوں (کویت جانے سے چند دن پہلے کا سماں)
دن رات یہ کب تک بھاری ہیں۔ جب تک یہ سانسیں جاری ہیں۔

صحرا میں کنول

پو پھٹے امیر علی اٹھا۔ اس نے اپنے سیاہ و سفید مگر خوب موٹے و تازے بیلوں کی جوڑی کو جوتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کھیتوں کی طرف چل دیا۔ صبح صادق کی ہلکی ہلکی خوشبودار ہوا کے سنگ چلتا اپنے کھیت میں پہنچا اور اللہ کا نام لے کر کھیت کھانے لگا۔

شمس مسرت نے رات بھر کے آرام کے بعد کالے کوسوں پربت کے دامن سے اپنا درخشندہ سر نکالا تو چہار سو اجالا ہی اجالا بکھر گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس روز امیر کا من بھی خوشیوں کی کرنوں سے روشن ہوگیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر ستانے کے لئے باٹ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے آپ سے محو گفتگو ہوا۔

"نہ جانے آج میرا دل امواج مسرت کے ساتھ ساتھ کیوں لہرا رہا ہے۔"

اچانک ایک معصوم بچے (ننھے خاور) کی شیریں آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "اوچچا اوچچا..... تمہارے گھر کے جلوخانے میں ہیجڑے ناچ و گا رہے ہیں۔"

امیر جہاندیدہ مزارعہ تھا۔ وہ پہلے ہی ندیاں شادمانی میں ڈبکیاں لے رہا تھا۔ فوراً اس کی چھٹی حس کا جھروکا کھل گیا۔ اس نے مسکاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں ننھے خاور سے پوچھا "بیٹا خاور... کیا ہمارے گھر میں چاند اترا ہے؟ کیا ہمارے گھر میں گلاب کا پھول کھلا ہے؟"

"ارے چاچا تمسخر نہ اڑاؤ۔ بھلا چاند کدھر سے آئے گا۔ چاند تو تب کھیت کرے گا جب سورج ڈوب جائے گا اور رات کا اندھیرا چاروں اطراف پھیل جائے گا۔" خاور نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"ارے زیرک منے۔ میں یہ تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں کہ آسمان کا چاند اتر آیا ہے' میرا مطلب تو یہ ہے کہ میرے گھر میں آسمان سے نومولود ٹپکا ہے۔ جو چاند جیسا خوب صورت ہے۔ بالکل چاند جیسا" امیر نے خاور کے گلابی رخسار پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں چچا۔ تیرے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہت خوب صورت" خاور نے بغلیں بجاتے ہوئے کہا۔

امیر نے خوشی کی ندی میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے ننھے خاور کو اوپر اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھالیا اور بیلوں کی جوڑی کو ہانکتا بسرعت گھر کی طرف چل دیا۔

جونہی وہ گھر کے پاس پہنچا تو اس کے کانوں میں مخنثوں کے رقص پر بیٹھے بول نے امرت کا رس گھول دیا۔

امیر کے آنگن میں۔ شادمانی کے جلو میں
بہت ہی سندر سا۔ اک چاند ہے اترا

اس نے کندھے سے خاور کا اتارا اور خوشی خوشی کمرے کے اندر گیا جہاں نومولود اپنی ماں کے پہلو میں لیٹا تھا۔

اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے پیکر وفا بیوی کو دیکھا اور فخر سے مبارک دی اور بیٹے کو اٹھا کر چومنے لگا۔

"ارے منے کے ابا یہ کیا کر رہے ہو۔ پہلے منے کے کانوں میں اذان تو دو" ارشاد بیگم نے اتراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا ارشاد بیگم" امیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس نے نوزائیدہ کو ماں کے پہلو میں لٹادیا اور دونوں کانوں میں باری باری اذان دی۔

"میرے خیال میں اپنے چاند کا نام حشمت علی رکھ دیں" امیر نے زیرلبی تبسم سے پوچھا۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے" ارشاد بیگم نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

معاً باہر سے ہیجڑوں کے سردار کی آواز آئی "امیر صاحب۔ کیا اپنی امارت کے ڈھیر سے کچھ روپے نکال کر ہمارے دامن میں نہیں ڈالو گے۔"

امیر نے انگیٹھی پر پڑی جھٹ مٹی کی ڈولی اٹھائی اور باہر جا کر اس پر پڑے ہوئے

سارے کے سارے روپے زنخا کے دامن میں انڈیل دیئے۔

اف۔ امیر کو بیٹے کے جنم کی خوشی راس نہ آئی۔ دو دن ہی گزر پائے ہوں گے کہ ارشاد بیگم کو عضو مخفی میں سخت درد ہونے لگا۔ فوراً دائی رضیہ کو دکھایا گیا۔ رضیہ جس نے زچگی کرائی تھی بتایا "ارشاد بیگم کے رحم میں زخم ہو گیا ہے۔"

رضیہ کی غفلت تھی یا امیر کی قسمت کہ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ ارشاد بیگم رہ رہ کر تڑپتی رضیہ نے ہزار جتن کئے کہ وہ ٹھیک ہو جائے لیکن بے سود۔

امیر اپنی بیگم کو تڑپتا نہ دیکھ سکا۔ وہ اسے ہیڈ کوارٹر اسپتال لے گیا۔ جہاں اسے ایڈمٹ کرلیا گیا۔ دو دن اس کا علاج کیا گیا۔ تیسرے دن اسپتال والوں نے جواب دے دیا۔ انہوں نے امیر کو ہدایت کی۔

"اگر تو اپنی بیوی کی زندگی کو بچانا چاہتا ہے تو اسے جنرل اسپتال راولپنڈی لے جا۔"

افسوس صد افسوس گاؤں میں انسان کی زندگی کتنی اجیرن ہوتی ہے۔ انسان کو بنیادی سہولتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ بجلی و پانی عنقا' پانی بھرنے کے لئے حوا کی بیٹی کو میلوں دور جانا پڑتا ہے۔ اگر کسی رحم دل ممبر اسمبلی نے اجراء کرا بھی دیا تو پھر بھی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ نلوں سے پانی کچھوے کی چال کی مانند نکلتا ہے۔ اور عورتوں کو پانی بھرنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کے مٹکوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی ہے بالکل اس طرح جس طرح اچھی فلم کے فلم بینوں کی لائن لگتی ہے۔ بے چارے فلم کے رسیا بھی گھنٹوں پہلے ٹکٹ لینے کے لئے لائن لگا لیتے ہیں۔

تعلیم اور صحت کا بھی فقدان۔ اگر بھولے سے اسکول و اسپتال بن بھی گیا تو پھر بھی گاؤں والا کا رکھا اللہ ہی ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا ہی کرم ہوتا ہے کہ نیم اچھے اساتذہ' مسیحاؤں اور اچھی عمارت کے زندہ بھی رہتے ہیں اور کلرک بننے کے لئے بچے کے لئے کچھ نہ کچھ تعلیم بھی حاصل کرلیتے ہیں۔"

بے چارے امیر کا گاؤں تو اچھا خاصا شہر تھا۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ شاید قارئین نے نام بھی سنا ہو گا پنڈ دادن خان کا۔

پنڈ دادن خان میں اسپتال تھا لیکن امیر کی بیگم کا علاج نہ ہوسکا۔ کیونکہ اسپتال ہونے کے باوجود وہاں اسپتال کے لوازمات کا فقدان تھا۔ مثلاً لیبارٹری' آپریشن تھیٹر۔ ایکسرے مشین اور اسپیشلسٹ ڈاکٹرز وغیرہ۔

لہٰذا امیر نے آٹھ سو روپے پر اسپتال کی ایمبولینس کرائے پر لی اور اپنی بیوی کو لے کر راولپنڈی کی طرف چل دیا۔ پانچ میل کے بعد کھیوڑہ شہر سے کوہستان نمک کا پہاڑی سلسلہ چل پڑا۔ ایمبولینس پگڈنڈی (سڑک نہیں کہوں گا) پر رینگنے اور ڈولنے لگی۔

ارشاد بیگم تو پہلے ہی درد سے مررہی تھی۔ ابھی جو اسے ایمبولینس کے مزید جھٹکے لگے تو وہ بری طرح کراہنے لگی۔ وہ چیخنے لگی۔ اس کی چیخوں پر امیر کا کلیجہ منہ کو آگیا.... لیکن بے چارہ کیا کرتا.... آنکھوں سے مینہ برساتا رہا.... ایمبولینس رقص کرتی رہی.... اور ارشاد بیگم کراہتی رہی۔

ابھی آدھی گھاٹی کا فاصلہ بھی طے نہ ہو پایا تھا کہ گھاٹی کے لب واقع معروف پانی کے تالاب کے نزدیک ارشاد بیگم کی چیخیں بند ہو گئیں۔

وہ اللہ کو پیاری ہو گئی.... امیر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ پھر ایمبولینس کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا گیا۔

لاش گھر پہنچی تو حسب معمول نوجوان عورت کی موت پر اعزا و اقارب خوب روئے۔ اتنا روئے کہ آسمان بھی رونے لگا۔ آخر ارشاد بیگم کو منوں مٹی کے نیچے دفنا دیا گیا۔

قل شریف کے بعد ننھے حشمت کو اس کی نانی صغرا اپنے ساتھ لے آئی تاکہ اس کی مناسب دیکھ بھال کر سکے۔ اس کے نانا سلطان احمد کا گھر تقریباً ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر دوسرے محلے میں واقع تھا۔

ماں ارشاد کے مرنے کا حشمت کی صحت پر کچھ اثر نہ پڑا۔ اس لئے کہ سلطان احمد کے گھر صرف گائے ہی نہیں بلکہ بکری بھی تھی۔ جن کا وہ دودھ پیتا۔ اور نانی و خالہ شمشاد دونوں اس کی خوب دیکھ بھال بھی کرتیں۔

شمشاد کی صرف ایک ہی بہن ارشاد تھی جو اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بھائی کو دو سال کی عمر میں نمونیا ہوا تھا اور وہ مر گیا تھا۔

شمشاد بیگم جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ اس نے اپنے من میں اپنے پڑوسی ارشد کے لڑکے جمشید کو بسا رکھا تھا۔ جو فوج میں حوالدار کے عہدے پر فائز تھا۔ اور اس کی طرح خوب صورت بھی بہت تھا۔ تنومند اور صحت مند۔

وہ تو برسوں سے جمشید کو جانتی تھی۔ پڑوسی جو تھا۔ لیکن وہ اس کے دام محبت میں گرفتاری پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب وہ سالانہ تعطیلات پر گھر آیا تھا۔

عیدالفطر کا مبارک دن تھا۔ اس نے پیلے دبھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ بالکل سورج مکھی لگ رہی تھی۔ عید کی مناسبت سے اس کی ماں نے حلوہ و پوری بنایا تھا۔ اس کی ماں نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ ڈالا اور اوپر دو پوری رکھ کر بولی "شمشاد۔ جاؤ بیٹی پڑوس میں حلوہ پوری دے آؤ۔"

تو وہ حلوہ پوری لے کر جمشید کے گھر آئی اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو جھٹ دروا ہوا۔ سامنے جمشید کھڑا تھا۔

شاید جمشید سفید کرتا و قمیص پہنے نماز پڑھنے جا رہا تھا۔ وہ شمشاد کو دیکھتے ہی متحیر ہو کر بولا "اری شمشاد۔ کیا تم شمشاد ہی تو ہو.... یا میری آنکھیں دھوکا کھا گئی ہیں۔ تم اتنی بڑی ہو جاؤ گی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تم تو پری لگتی ہو۔ بالکل پری۔"

تو وہ شرما گئی اور فوراً گھر کے اندر چلی گئی اور حلوہ دے کر وہ واپس آ گئی جبکہ جمشید نماز پڑھنے عید گاہ چلا گیا۔

وہ گھر گھستے ہی آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے سراپے کو دیکھنے لگی۔ وہ آنکھوں میں سپنے سجائے اپنے پرتو سے مخاطب ہوئی "میں پری ہوں.... پری.... ہاں ہاں پری۔"

پھر تو وہ روزانہ جمشید کے گھر جانے لگی۔ وقت مل جانے پر جمشید سے میٹھی میٹھی باتیں کر لیتی۔ جمشید بھی مسکرا مسکرا کر اس کی باتوں کا جواب دیتا۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں

جشید نے اس سے پوچھ لیا۔

"شمشاد۔ تم کس خوش قسمت لڑکے سے شادی کروگی؟"

"تم سے" اس نے شرم سے منہ چھپا لیا اور دبے لفظوں جواب دے کر الٹے پاؤں بھاگ آئی۔

لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ اس کی زندگی کی ڈوری تو کسی اور کے ساتھ بندھ چکی تھی ایک روز اس نے اپنی ماں صغرا کو یہ کہتے سنا۔

"سرتاج۔ شمشاد جوان ہو چکی ہے۔ اب وہ اپنے گھر کا بوجھ بخوبی سنبھال سکتی ہے۔ لٰہذا اگر اس کی شادی کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔

"اب اس کی شادی کا سما بھی ہے... اور حالات کا تقاضا بھی۔"

"شادی کا سماں بھی اور حالات کا تقاضا بھی۔ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔ ذرا کھل کر بات کرو" سلطان احمد نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"میرے سر کے سائیں۔ مجھ بوڑھی سے لوتھڑے حشمت کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ یہ کام تو صرف ماں اور صرف ماں ہی کر سکتی ہے۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد صغرا دوبارہ گویا ہوئی "میرے خیال میں حشمت کی ماں صرف اور صرف شمشاد ہی بن سکتی ہے۔ وہ ارشاد مرحومہ کی صحیح نعم البدل ہی۔ وہ ہی اپنے بھانجے کو بیٹے کی طرح پال سکتی ہے۔ اور اگر کوئی ڈائن امیر کے گلے بندھ گئی تو پھر حشمت کی زندگی برباد..."

اس نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "ایک اور زیر غور بات وہی ہے جو ہم نے ارشاد کی شادی کے وقت سوچی تھی۔ وہ یہ کہ امیر علی کے والدین مر چکے ہیں۔ اس کا کوئی بھائی نہیں صرف ایک بہن ہے۔ جو بہت دور بہاول پور بیاہی گئی ہے......"

امیر آٹھ ایکڑ زمین کا مالک بھی ہے۔ وہ ہمارا دیکھا بھالا بھی ہے۔ اس نے ارشاد کو شہزادیوں کی طرح رکھا۔ وہ بہت ملنسار اور خدمت گزار بیٹا ہے... شمشاد بھی ارشاد کی طرح عیش [illegible] بھی کچھ پڑا کر تہیں۔"

"ہاں ... میں سمجھ گیا.... تو بالکل ٹھیک کہتی ہے .... لیکن اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں شمشاد اور امیر دونوں سے رائے لینی ہوگی" سلطان احمد نے پتے کی بات کی۔

صغرا جل کی بولی "ارے بھولے سرتاج۔ بھلا بیٹیوں سے بھی کوئی شادی کے بارے میں پوچھتا ہے.... کیا میری ماں نے تجھ سے شادی کرتے وقت مجھ سے پوچھا تھا۔ کیا تو نے ارشاد مرحومہ کی شادی کرتے وقت اس کی مرضی لی تھی۔"

"نہیں تو۔"

"تو پھر شمشاد سے بھی پوچھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن امیر سے تو پوچھنا پڑے گا۔"

"ارے کورے عقل کے سردار۔ امیر سے کیا پوچھنا.... اس کا تو پور پور شمشاد کی محبت کی ندیا میں غریق ہے۔ وہ تو بارہا مجھ سے کہہ چکا ہے۔ اماں حشمت کو ماں کا پیار صرف اور صرف شمشاد ہی دے سکتی ہے۔ اگر میں شادی کروں گا تو صرف شمشاد سے۔ شمشاد کے علاوہ اگر کوہ قاف کے دیس کی پری بھی آجائے تو شادی نہیں کروں گا" صغرا نے چسکے لے لے کر امیر کی مرضی بتا دی۔

"تو پھر تو اپنے وارے نیارے ہو گئے ... شمشاد کا بھی مسئلہ حل ہو گیا اور حشمت کی زندگی بھی برباد ہونے سے بچ گئی" سلطان نے ہنستے ہوئے کہا۔

صغرا نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ اور ہنستے ہنستے اپنے سائیں کے ساتھ لیٹ گئی۔ آج اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جھکے ہوئے پیڑ پر بہار آگئی ہو.... اور پھر بہار کی ٹھنڈی معطر ہوا نے ان کے شجر حیات کی دونوں ڈالیوں کو ملا دیا ہو.... ملا دیا ہو۔

اس کے برعکس شمشاد کو ایسے لگا جیسے کہ اس کی زندگی میں ایک برا جھکڑ چل پڑا ہو۔ وہ نصیب کے شجر سے گر پڑی ہو اور برگ کی مانند ہوا کے سنگ اڑتی جا رہی ہو اور اسے اپنے ٹھکانے کا کوئی پتا نہ ہو۔

آہ بے چاری شمشاد۔ ظلمی ہوا سے بچنے کے لئے اس کے پاس کوئی حیلہ و وسیلہ نہ تھا۔

وہ تو مشرقی ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ جہاں مدافعت کرنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ اگر اس کا شہزادہ جمشید چھٹی پر آیا ہوتا تو وہ اس کی منت سماجت کرتی۔

"جمشید۔ رسم و رواج کی ظلمی ہوا کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور مجھے دردر کی ٹھوکریں کھانے سے بچالو۔"

وہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتے کوٹھری میں چلی گئی اور اپنی کھاٹ پر اوندھے منہ گر پڑی اور چھم چھم آنسو برسانے لگی۔ وہ کب سوئی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ اسے تو تب پتا چلا جب اسے دن کے دس بجے ماں نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"او.... شادو کی بچی.... اٹھ.... دیکھ تو سہی سورج سر پر آگیا ہے.... چارپائی کے اوٹ میں بالٹی پانی بھر کر رکھ آئی ہوں۔ چارپائی پر نیا جوڑا کپڑوں کا بھی رکھا ہے.......... غسل کر کے ان کو پہن لے۔ آج سے تو نے مائیوں بیٹھنا ہے۔"

"ماں۔ مائیوں کیا ہوتا ہے؟" شمشاد نے آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

"اری بیٹی۔ نادان بیٹی۔ ابھی ہفتہ بھر میں تیری شادی ہو جائے گی۔ شادی سے پہلے لڑکی کو مائیوں بٹھا دیا جاتا ہے" صغرا نے اپنی بیٹی کو پیار سے بتایا۔ اور شمشاد لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ چارپائی کی اوٹ میں گئی۔ اور ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بھڑکیلے کپڑے پہن کر باہر آگئی۔

تو صغرا خوش ہو کر بولی "اری شمشاد۔ آج تو تم پری لگ رہی ہو.... نظر بد دور۔" اور پھر ہفتے کے اندر وہ پیا کے دیس آگئی۔

پیا نے سہاگ رات ہی اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ وہ گھونگھٹ اٹھاتے ہی کورنش بجالایا "زہے نصیب۔ غریب خانے پر پری آگئی ہے۔"

بھلا امیر اس کی آؤ بھگت کیوں نہ کرتا۔ وہ تو واقعی پری تھی.... چشم آہو' سرو قد' گورا رنگ' صراحی دار گردن۔ سڈول جسم گھنے اور لمبے بالوں میں لپٹا۔ سہاگ رات مناتے اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کہ اسے جنت مل گئی ہو۔

کردی گئی۔ اس طرح وہ تو نو عروس چمن تھی۔ وقت اور محبت کے معطر جھونکے نے کچی کلی کو شگفتہ پھول بنا دیا۔ شوہر کے اتھاہ پیار نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ بے سے کی جمشید کی محبت کو بھول جائے۔ اور اپنے مجنوں امیر علی کی لیلیٰ بن جائے اپنے مجنوں کی لیلیٰ۔

۹ ماہ کے بعد ان کے آنگن میں شگفتہ پھول کھلا۔ جس کا نام انہوں نے عظمت علی رکھا۔ انہوں نے عظمت کے جنم دن پر خوب خوشیاں منائیں۔ عقیقہ کے روز پانچ بکرے ذبح کئے۔ دس دیگ بریانی اور دو دیگ زردے کی بنائیں اور تمام رشتے داروں اور محلے والوں کی پرتپاک دعوت کی۔

عقیقہ کی رات ڈھل گئی تو شمشاد نے اپنی ماں سے کہا۔

"ماں۔ اب تو عظمت کا بوجھ بھی میرے کندھوں پر پڑ گیا ہے۔ حشمت صرف ایک سال کا ہے اور صحیح طور پر چل بھی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ میرے لئے مشکل بلکہ بہت مشکل ہوگا کہ میں دو بچوں کو سنبھال سکوں۔ میری آرزو ہے کہ عظمت کے چلنے پھرنے تک حشمت کی پرورش کی ذمے داری تم اپنے ذمے لے لو۔"

شمشاد کی ماں صغرا ہنسیاں بکھیرتے ہوئے بولی "اری بیٹی۔ آج تو میں خدا سے کچھ اور مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔ میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی۔ لیکن اس سے کچھ زیادہ تجھ سے کہنا ہے بلکہ مانگنا ہے۔ میں حشمت کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اسے اپنا بیٹا بنا کر پالوں گی۔ بیٹی تمہارے جانے کے بعد اکیلے میں گھر ہمیں کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ سونا سونا لگتا ہے حشمت کے آنے سے ہم دونوں میاں بیوی کے گھر میں پھر سے بہار آجائے گی۔ ہمیں ایسے لگے گا جیسے ارشاد بیٹی ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔"

شمشاد نے سوچتے ہوئے کہا "مجھے حشمت کی کیا ضرورت ہے.... اللہ نے میری گود ہری کردی ہے.... میرا بیٹا چاند سے بھی بڑھ کر خوب صورت ہے۔"

○☆○

سلطان احمد نہایت غریب آدمی تھا۔ وہ کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے جو کچھ

کمایا تھاوہ بچیوں کی شادی پر خرچ کردیا تھا۔ اس کی گزر اوقات مزدوری پر تھی۔ وہ عمارت تعمیر کرنے والے مستریوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس وقت دہاڑی ۳۰ روپے تھی۔ مشکل سے دال روٹی کا خرچ نکل پاتا۔ جانکاہ محنت کے سبب اس کے بالوں میں سفیدی آئی تھی۔ وہ بوڑھا لگتا تھا جب کہ اس کی عمر صرف ۳۰ سال تھی۔

حشمت کے گھر آنے سے سلطان اور اس کی بیوی صغرا کے لئے درحقیقت روٹھی ہوئی بہاریں لوٹ آئی تھیں۔ سلطان تو جوان ہوگیا تھا۔ اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ گئی تھیں۔ وہ کام سے گھر لوٹتا تو آتے ہی حشمت کو والہانہ انداز سے اٹھالیتا اور خوب چومتا۔ پھر صافے کے پلو میں باندھی ہوئی برفی جو وہ آتے ہوئے بازار سے لے آتا نکالتا اور منے کو کھانے کے لئے دیتا۔ پھر وہ منہ ہاتھ دھوکر اپنی بیوی اور منے کے ساتھ چوکی پر بیٹھ جاتا اور مزے لے لے کر کھانا کھاتا۔

حشمت منا پونے دو سال کا ہوا تو سلطان کے گھر میں پہلی بار عیدالفطر خوشیاں لے کر آئی۔ اس نے پورے پانچ دن کی مزدوری سے منے کے خوب صورت کپڑے سلوائے تھے۔ اس نے اپنے داماد امیر اور بیٹی شمشاد کو بھی اپنے گھر میں عید منانے کی دعوت دے رکھی تھی۔ اس روز صغرا نے بھی طرح طرح کی مزیدار ڈشیں بنائی تھیں۔ ماشاءاللہ اس وقت پپو عظمت بھی ۹ ماہ کا ہو چکا تھا۔

سلطان اپنے پیاروں کے ساتھ عید منا کر بہت مسرور تھا لیکن ایک قلق اسے ضرور تھی۔ پپو نے عید روز جو کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے معمولی سی قمیص اور چڈی پہن رکھی تھی۔ وہ بہانے ہی بہانے میں بازار گیا کہ پپو کے لئے ریڈی میڈ کپڑے لے آئے لیکن بے سود۔ کیونکہ اس دن تمام دکانیں بند تھیں۔

دوسرے روز وہ پپو اور منے کے لئے ایک جیسی پینٹ وقمیص لے آیا۔ اس نے شمشاد بیٹی کو چھکتے ہوئے کہا۔

"شمشاد بیٹی۔ میں پپو اور منے دونوں کے لئے ایک رنگ کی قمیض اور پینٹ لے آیا ہوں۔ بیٹی ان کو جھٹ سے پہنادو۔"

"اچھا ابو جی۔"

پھر جب اس نے ان دونوں کو پینٹ وقمیص میں ملبوس دیکھا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ وہ لہک لہک کر ان کو باری باری اٹھاتا اور انہیں چومتا۔

وقت اپنی رفتار سے گزرنے لگا۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں گزرنے لگا۔ حشمت نے زندگی کے زینے کے چھٹے قدم پر قدم رکھ دیا۔ وہ ڈیل ڈول اور رنگ وروپ کے لحاظ سے اپنے بھائی عظمت سے دو قدم آگے تھا۔ وہ کپڑے بھی بہت خوب صورت پہنتا تھا۔ وہ اپنی نانے ونانی ہی کو ابو وامی سمجھتا تھا۔ وہ اپنی خالہ اور ابو کو چھوٹی امی اور چھوٹے ابو کہتا تھا۔ وہ جب کبھی چھوٹی امی کے گھر آتا تو چھوٹی امی اسے خوب صورت کپڑوں میں دیکھ کر جل تو اٹھتی لیکن ظاہری طور پر وہ اسے خوب چومتی۔ جب کہ اڑوس پڑوسی حشمت کو دیکھ کر نانے اور نانی دونوں کی بہت تعریفیں کرتے "شاباش۔ حشمت کے نانے ونانی پر جنھوں نے اسے شہزادوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔"

٭٭٭

پپو حشمت کو نانی اماں روایتی قسم کی کہانیاں بھی سنانے لگی۔ وہ کہانیاں جو پیڑھی در پیڑھی منتقل ہوتی چلی آئی تھیں۔ پپو اس وقت تک نیند کی آغوش میں نہیں جاتا تھا جب تک وہ نانی ماں سے کہانی نہ سن لیتا (یہ معیاری اور اچھوتی کہانیاں آپ میرے بچوں کے ناول کنول میں پڑھ سکتے ہیں)

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ حشمت تیسری جماعت میں پہنچ گیا اور اس کا چھوٹا بھائی عظمت پانچویں جماعت میں۔ وہ اپنے بھائی سے دو جماعت پیچھے اس لئے رہا تھا کہ وہ اسکول میں داخل لیٹ ہوا تھا۔ اس کے نانے کو اسے پڑھانے میں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر کبھی کوئی رشتہ دار اسے حشمت کو اسکول داخل کرانے کے لئے کہتا تو وہ روکھا سا جواب دیتا تھا۔

"حشمت کون سا پڑھ لکھ کر تحصیل دار بن جائے گا۔ وہ تو اپنے نانے کی طرح مزدوری ہی کرے گا۔"

لیکن ایک روز اس نے اپنے لنگوٹیے یار کے آگے ہتھیار ڈال دیے کیوں کہ اس نے

ایک چبھتا سوال کر ڈالا تھا۔

"یار سلطان۔ ارشاد بیٹی کی روح ضرور تڑپتی ہوگی۔"

"وہ کس لئے۔"

"اس لئے کہ حشمت اور عظمت دونوں ایک باپ کے بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا اسکول جا رہا ہے کیونکہ اس کی ماں زندہ ہے۔ اور دوسرا بیٹا کھیل کود میں وقت گزار رہا ہے۔ اس لئے کہ اس غریب کی ماں مر چکی ہے۔ وہ یتیم ہو چکا ہے۔"

"یار نواز۔ حشمت کو یتیم نہ کہو۔ اس کا باپ زندہ ہے۔"

"سلطان۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ تجھے ضرور کہتا کہ حشمت کو اسکول داخل کرا دو۔ اگر تم اس کی بات نہ مانتے تو اسے اختیار تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے پاس لے جاتا۔ لیکن اسے اور اس کی خانہ کو حشمت سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے...... دلچسپی ہو بھی کیسے جب کہ شمشاد کے بطن سے ہی ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو چکی ہے۔"

نواز نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "حیف صد حیف شمشاد کی بیٹی انجمن بھی اسکول میں داخل ہو چکی ہے لیکن حشمت کی کسی کو پروا نہیں ہے.... نہ ہی نانے اور نہ ہی باپ اور خالہ کو۔ بھئی خالہ تو سوتیلی ماں جو بن گئی اور امیر بھی شاید.... سوتیلا باپ بن چکا ہے۔ لیکن سلطان علی تم تو حشمت کے حقیقی نانا ہو۔ پھر تم کیوں حشمت کو اسکول میں داخل نہیں کراتے۔ خدارا اپنی بیٹی کی تڑپتی روح کا خیال کرو۔"

"بس کرو نواز۔ بس.... میں آج ہی حشمت کو اسکول میں داخل کرانے جاتا ہوں۔"

پھر وہ سیدھا اسکول گیا اور حشمت کو اسکول میں داخل کر آیا۔ اسکول میں داخل کرانے کے بعد وہ سیدھا اپنی بیٹی کے گھر گیا اور خوشیوں سے سرشار ہو کر بولا۔

"بیٹی بیٹی' آج میں تجھے خوش خبری سنانے آیا ہوں۔"

"بابا۔ کون سی خوش خبری ہے۔"

"آج میں تیرے بیٹے حشمت کو بھی اسکول میں داخل کرا آیا ہوں۔ ابھی وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی [illegible] تمہارا [illegible] تو ضرور بنے گا۔"

"حشمت تھانے دار بنے گا" شمشاد نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال" شمشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اری کم بخت۔ حشمت تیرا اپنا بیٹا ہے تو اپنے بیٹے اور اپنے باپ کا مذاق اڑا رہی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی" سلطان نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"بابا۔ حشمت میرا بیٹا نہیں ہے۔ حشمت تو ارشاد بہن کا بیٹا ہے اور امیر کا۔ میرا بیٹا تو عظمت ہے اور بیٹی انجمن۔ دونوں ماشاء اللہ اسکول جاتے ہیں۔ اور یہ حشمت تو سارا دن چرسی لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ چرسی بنے گا.... چرسی۔"

"شمشاد۔ تم بڑی بے غیرت ہو۔ نہ تمہیں باپ کا لحاظ ہے اور نہ تمہیں اپنی مری ہوئی بہن کا احساس ہے۔ جانے تم کس پر گئی ہو" سلطان نے غصے سے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

"ارے بابا۔ کدھر جاتے ہو.... میں تمہیں روٹی کھائے بغیر کیسے جانے دوں گی" شمشاد نے ہنستے ہوئے بابا کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی بات کو بڑھاتے ہوئے کہا "بابا۔ میں تو تیرے ساتھ مذاق کر رہی تھی مذاق۔ حشمت تو میرا بھی بیٹا ہے۔ حشمت پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا تو میرا دل بھی ٹھنڈا ہوگا۔"

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جہاندیدہ سلطان سمجھ چکا تھا کہ اس کی بیٹی شمشاد' حشمت کو خالہ کا پیار بھی نہیں دے سکتی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کی بیٹی چاپلوسی کا جال بن رہی تھی۔ لہٰذا وہ بے دلی سے روٹی کے چند نوالے لے کر آ گیا۔ جبکہ شمشاد شور مچاتی رہی "بابا روٹی تو کھالو۔ تھوڑی دیر کو تو سہی.... چند دکھ سکھ کی باتیں تو کرلیں۔ بابا جانی تم بڑے ظالم ہو.... بڑے ظالم۔"

O✡O

ایک روز حشمت اسکول سے واپس آیا تو بڑی اماں گھر نہیں تھی۔ وہ بہت گھبرایا۔ وہ بھاگتا ہوا پڑوسن خالہ زلیخا کے پاس گیا اور مرجھائے دل سے بولا "خالہ جی۔ میرے ماں آپ

کے گھر تو نہیں آئی۔"

"نہیں بیٹا۔"

"تو پھر کہاں چلی گئی ہے؟ وہ میری چھٹی کے وقت تو ہمیشہ گھر ہی رہتی تھی۔"

"بیٹا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری پڑوسن کے گھر میں کسی کام کے سلسلے میں گئی ہو۔"

"ٹھیک ہے خالہ جی۔"

پھر حشمت نے اڑوس پڑوس سے بڑی ماں کا پتا کیا جب وہ کہیں نہ ملی تو بڑے ابا کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت وہ گارے کی پرات اٹھائے زینہ چڑھ رہا تھا۔ حشمت اپنے بابا کو محنت طلب کام کرتے ہوئے افسردہ دل کے ساتھ دیکھنے لگا۔ جونہی سلطان مستری کو گارا دے کر نیچے اترا تو اس نے سامنے حشمت کو کھڑا دیکھا تو بڑھ کر گلے لگا لیا۔

"بیٹا۔ کیسے آگئے ہو...... روٹی کھائی کہ نہیں۔"

"باباجانی۔ ماما جانی کدھر گئی ہے۔ میں ان کے بغیر روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

"اس وقت تو چار بج چکے تھے۔ وہ سلطان کی چھٹی کا وقت تھا۔ وہ افسردہ لہجے میں بولا

"بیٹا چار بج چکے ہیں اور تم ابھی تک بھوکے ہو...... آؤ میرے ساتھ گھر چلو اور روٹی کھاؤ۔"

"نہیں بابا' میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

"اچھا روٹی نہیں کھانا۔ چلو گھر تو چلیں۔"

جب دونوں نانا نواسا گھر پہنچ گئے۔ تو سلطان نے ہاتھ بھی نہ دھوئے۔ سیدھا رسوئی میں گھسا اور روٹی اٹھا کر لے آیا۔

"آؤ بیٹا کھانا کھائیں۔"

"بیٹا۔ ضد نہ کرو۔ کھانا کھالو... نہیں تو میں رو پڑوں گا۔"

"لیکن بابا... تم کیوں روگے؟"

"اس لئے کہ میرا بیٹا بھوکا ہے۔"

"تو پھر پہلے مجھے بتاؤ کہ میری ماں کدھر گئی ہے؟"

"اوہو... تو میرا دل جانی روٹی اس لئے نہیں کھا رہا ہے کہ اس کی ماما جانی گھر میں نہیں

ہے۔"

"ہاں بابا۔"

"بیٹا۔ تمہاری ماما تو کھیوڑہ شہر گئی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"بیٹا۔ ہمارے فلاں دور کے رشتے دار کا باپ مر گیا تھا۔"

"تو بابا تم چلے جاتے۔"

"بیٹا۔ اگر میں جاتا تو دیہاڑی جاتی۔ مزید برآں ٹھیکے دار مجھے چھٹی بھی نہ دیتا۔ بیٹا وہ عمارت جس کی تعمیر کا اس نے ٹھیکہ لے رکھا ہے وہ پورے ایک سال میں بنے گی۔ اس طرح ایک سال تیرے بابا کی مزدوری کھری۔"

پھر وہ منے کا پیار لیتے ہوئے بولا "بیٹا۔ میں کام پر چلا آیا تھا تو تمہاری ماں میرے پاس آئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کھیوڑہ سے نائی آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ راجہ مر گیا ہے۔ تو میں نے تمہاری ماں کو کہا تھا کہ وہ چلی جائے۔"

"بابا۔ راجہ کون ہے؟"

"بیٹا۔ وہی کھیوڑہ شہر کے ہمارے رشتے دار جھانیا کا باپ۔"

"بابا۔ اماں رات کو تو گھر آجائے گی ناں؟"

"نہیں بیٹا۔ وہ تو کل صبح آئے گی۔"

"تو پھر مجھے رات کو کہانی کون سنائے گا؟"

"بیٹا۔ آج رات میں تجھے کہانی سناؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔ پھر تمہاری میری دوستی پکی' آؤ روٹی کھالیں۔"

پھر دونوں نانا نواسے نے روٹی پیٹ بھر کر کھائی۔

شام کے گھنگھے اندھیرے کو رات کی سیاہی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو حشمت کو نانا نے چڑیل کی کہانی سنائی۔

وقت گزرتا گیا۔ پپو کا صغیر سنی کا زمانہ پیچھے رہ گیا۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

اس کا چھوٹا بھائی عظمت دسویں جماعت میں اور اس کی اکلوتی بہن انجمن ساتویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔

وہ ہر لحاظ سے اپنے بھائی سے آگے تھا۔ خوش پوش تھا کیونکہ اس کا نانا سلطان علی اسے طرح طرح کے کپڑے خرید کر لے دیتا تھا۔ وہ اچھے قسم کے کھانے کھاتا تھا۔ وہ اسکول میں حدورجے کا ذہین و شریف طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی کلاس میں فرسٹ یا سیکنڈ پوزیشن ضرور لیتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بلا کا تیز و ہوشیار تھا۔ ہاکی ٹیم کا تو کیپٹن تھا۔

شمشاد بیگم حشمت کی سوتیلی ماں تو اس سے پہلے ہی جلتی تھی اور اس سے ناروا سلوک کرتی تھی لیکن تب تو اس کا چھوٹا بھائی عظمت بھی اس سے جلنے لگا تھا۔ البتہ انجمن اس سے پیار کرتی تھی۔ لیکن حشمت کو ماں اور بھائی کے جلنے کا قطعی احساس نہ تھا۔ وہ تو روپہلی کے ساتھ اپنی روپہلی راہ پر گامزن تھا۔

O✿O

ماہ طرح طرح کے روپ بدل کر گزرتے رہے۔ حشمت بارہویں جماعت اور اس کا چھوٹا بھائی عظمت چودہویں جماعت کے فائنل امتحان کی تیاریاں کر رہا تھا۔ حشمت کا امتحان تو سر پر آگیا تھا۔ حشمت ذہین ترین لڑکا تھا۔ اسکول کے ارباب اختیار کو اس کی لیاقت پر ناز تھا اور وہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ حشمت بورڈ میں پہلی پوزیشنوں میں کوئی ایک پوزیشن حاصل کرکے اسکول کی شہرت و مقبولیت کو بام عروج پر پہنچائے گا۔

تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ کے مطابق ان کی تدبیریں الٹی ہوگئیں۔ حشمت کی تقدیر برگشتہ ہوگئی۔ اس کی خوشیوں سے بھرے گلستان میں خزاں آگئی۔

ہوا یوں کہ اس کا نانا ابا حسب معمول دہاڑی پر گیا ہوا تھا اور سر پر گارے کی تگاری اٹھائے زینہ چڑھ رہا تھا کہ بدن کے ڈولنے سے وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ اس کی ہائے ہائے کی آواز سن کر مستری اور مزدور چھت کے نیچے اتر آئے۔ وہ چھت پر مٹی ڈال رہے تھے۔ ان سب نے مل کر سلطان کو چارپائی پر ڈال کر گھر پہنچایا۔ کیونکہ وہ چلنے اور اٹھنے کے قابل نہ تھا۔ شاید ان کی کمر کی ہڈی کا فریکچر ہوگیا تھا۔

حشمت نے اپنے نانے ابا کو کراہتے ہوئے دیکھا تو وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں چھم چھم مینہ برسانے لگیں۔ صغرا پر بھی مصیبتوں و غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے گریہ و زاری کرتے ہوئے حشمت کو کہا۔

"بیٹا۔ جلدی سے جاؤ اور بازار سے سیانے حکیم ملنگ خان کو بلا لاؤ اور بازار جاتے ہوئے اپنی خالہ اماں کو بھی بتا جانا کہ اس کے ابو کی حالت سخت خراب ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد شمشاد اپنے خاوند امیر کے ساتھ روتے ہوئے پہنچ گئی۔

"ہائے۔ میرے بابا کو کیا ہوگیا؟"

معاً حشمت حکیم ملنگ کو لے کر پہنچ گیا۔ حکیم نے سلطان کے نچلے دھڑ کی خوب مالش کی۔ اور درد کی دو گولیاں بھی کھلائیں۔ جانے سے پہلے حکیم نے امیر سے کہا۔

"امیر علی۔ یہ دو دن کی گولیاں دے رہا ہوں۔ دن میں تین دفعہ دو دو گولیاں ان کو پلانی ہیں۔ صبح و شام میں خود آکر مالش کیا کروں گا۔ اللہ کو منظور ہوا تو آپ کے سسر دس دن کے اندر ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ہاں۔ میری فیس، پچاس روپے" حکیم نے امیر سے کہا۔ امیر نے جیب کو ٹٹولتے ہوئے شمشاد سے پوچھا "عظمت کی اماں۔ کیا تمہارے پاس پچاس روپے ہیں۔"

"نہیں عظمت کے ابا۔"

"حشمت بیٹا۔ چائے دانی میں سو روپے کا نوٹ پڑا ہے۔ جاؤ نکال کر لے آؤ" صغرا نے اپنی بیٹی اور داماد کی کھسر پھسر سننے کے بعد کہا۔

حشمت جھٹ اندر سے سو روپے کا نوٹ لے آیا اور ملنگ حکیم کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ حکیم نے دس دس کے پانچ نوٹ حشمت کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا بیٹا۔ میں شام کو مالش کرنے کے لئے آجاؤں گا۔ فکر نہ کرنا۔ اور نانا ابو کو نیم گرم آدھ سیر دودھ ضرور پلا دینا۔"

"اچھا۔ حکیم چاچا۔"

ملنگ حکیم صبح و شام آتا رہا اور سلطان کے نچلے دھڑ کی مالش کرتا رہا لیکن سلطان کو رتی

بھرا فاقہ نہ ہو۔ وہ تو بستر کی ساتھ لگ گیا۔ بے چارا پیشاب وغیرہ بھی چارپائی پر کرتا جس کی
ذمے داری اس کی عظیم بیوی صغرا پر تھی۔ اس نے اپنے سرکے سائیں کی بہت خدمت کی۔
اس کی خدمت کو دیکھ کر سب لوگ اس کی تعریفیں کرتے۔

آخر حکیم نے مشورہ دیا "صغرا بہن میری صلاح ہے کہ سلطان بھائی کو تحصیل ہیڈ کوارٹر
اسپتال دکھایا جائے۔ اگر میری دوا و مالش سے سلطان نے ٹھیک ہونا ہوتا تو پندرہ دن میں
ٹھیک ہو جاتا لیکن ابھی تو پورا ایک ماہ گزر گیا ہے۔ سلطان کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑی
ہی ہے۔"

"حکیم بھائی۔ اسپتال میں تو علاج کرانے کے لئے بہت پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
لیکن اب میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ سلطان کو سات دنوں میں مشکل سے دو
تین دن کے لئے کام ملتا تھا اور ان دنوں کی مزدوری سے بمشکل ہمارے گھر کا خرچہ چلتا تھا۔
حشمت کی فیس وغیرہ کا بندوبست میں اپلے بیچ کر کرتی..... ہائے اب میں کیا کروں۔"

"بہن حوصلہ رکھو اللہ مدد کرے گا" حکیم تسلی دے کر چلا گیا۔

"نانی اماں۔ اسپتال میں تو مفت علاج ہوتا ہے۔ ہم نانے ابو کو کل صبح ہوتے ہی اسپتال
لے جائیں گے" حشمت نے نانی اماں سے روہانسا ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔"

دوسری صبح حشمت اپنے کالج کے دوستوں کی مدد سے نانا کو چارپائی پر ڈال کر اسپتال لے
گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹر نے ایکسرے کرایا تو اسے پتا چلا کہ سلطان کی کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی'
وہ حشمت سے بولا۔ "اس اسپتال میں تمہارے نانا کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ابھی ان کا علاج
صرف ڈسٹرکٹ اسپتال میں ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں نے پہلے ہی بہت دیر کر دی ہے۔ جتنا
جلدی ہو سکے انہیں اسپتال ڈی ایچ لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔"

حشمت نے نانی اماں سے کہا "اماں۔ نانا ابو کو ڈی ایچ اسپتال لے جانا پڑے گا۔ جو
یہاں سے ۵۶ میل دور ہے۔ میں نے ویگن کے ڈرائیور سے معلوم کیا ہے۔ وہ وہاں پہنچانے

کے لئے ۲۵۰ روپے لے گا اور کھانے پینے وغیرہ کے خرچے کے لئے کچھ پیسوں کی ضرورت
ہوگی۔ وہ پیسے کہاں سے آئیں گے۔"

"بیٹا۔ خالہ کے پاس جاؤ اور پانچ سو روپے اس سے لے آؤ" صغرا نے روتے ہوئے
کہا۔

"ٹھیک ہے ماں..... آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ خالہ
پیسے دے گی۔ شاید خالہ کا خون سفید ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی میرے ابو امیر کا بھی۔"

حشمت دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی خالہ کے گھر گیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی
دروازہ خالہ نے ہی کھولا۔

"السلام علیکم۔ خالہ جان" حشمت نے خالہ جان کے بولنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"وعلیکم السلام۔ حشمت' کیسے آنا ہوا؟" خالہ نے پوچھا۔

"نانا ابا کو ڈی ایچ اسپتال لے جانا ہے۔ جس کے لئے کم از کم پانچ سو روپے کی ضرورت
ہے... میں یہ رقم لینے آیا ہوں۔"

"بیٹا۔ آؤ اندر تو آؤ۔ عظمت کے ابو سے پوچھتی ہوں' ہو سکتا ہے ان کے پاس کچھ پیسے ہوں۔"

شمشاد نے نیم پیار بھرے لہجے میں کہا۔ حشمت گھر کے اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا
کہ اس کا بھائی عظمت موڑھے پر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ عظمت نے بھی اپنے بھائی کو دیکھ لیا۔
دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر سلام کیا۔

"آؤ حشمت روٹی کھاؤ" عظمت نے مسکراتے ہوئے بڑے بھائی کو روٹی کھانے کی
دعوت دی۔

حشمت نے تو کئی دنوں سے ڈھنگ سے روٹی نہیں کھائی تھی۔ ویسے بھی اس کے پیٹ
میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ بھائی کے پاس روٹی کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے لقمہ
توڑا ہی تھا کہ خالہ شمشاد بولی "بیٹا حشمت۔ ٹھہرو.... یہ روٹی تو عظمت کی ہے جو کہ اسپیشل
میں نے اس کے لئے بنائی ہے۔ تمہارے لئے میں دوسری روٹی اور سالن لاتی ہوں۔"

پھر اس کی خالہ باورچی خانے میں گئی اور اس کے لئے رات کی بچی ہوئی روٹی اور باسی دال لے آئی۔ اور اس کے سامنے رکھ کر بولی۔

"بیٹا۔ یہ لو کھانا اور پیٹ بھر کر کھالو۔"

حشمت نے اپنے آگے رکھا ہوا کھانا دیکھا تو اس کی گہری آنکھوں میں شبنمی قطرے تیرنے لگے۔ وہ صرف دو لقمے ہی لے سکا۔ وہ بھی اس نے مشکل سے اپنے حلق سے اتارے تھے۔ کہ اس کے کانوں میں خالہ کی طنز سے بھرپور آواز پڑی۔

"بیٹا۔ کیا بات ہے تو نے کھانا نہیں کھایا۔ کیا دال پسند نہیں آئی۔ بیٹا اس دنیا میں اب بھی ایسے ان گنت لوگ ہیں جو ایک وقت کی روٹی بھی بھگوئی ہوئی مرچوں یا پیاز وغیرہ سے کھاتے ہیں۔"

"نہیں خالہ۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں نخرے وخرے بالکل نہیں کرتا۔ ایک تو نانا کی بیماری کی وجہ سے دل کو سکون نہیں ہے دوسرا دال خراب تھی اس سے بو آرہی ہے۔"

"ہیں کیا کہا۔۔۔ مجھ پر الزام لگاتا ہے۔۔۔۔ دیکھو تو سہی دال تو بالکل ٹھیک ہے" شمشاد نے دال کو چکھ کر کہا۔

معاً امیر کھانستا باہر آگیا اور بیٹے حشمت کو گلے لگا کر بولا۔ "آ بیٹا۔ تو آیا توں۔"

"شکریہ ابو۔"

"بیٹا" تیری آنکھوں میں آنسو کیوں تیر رہے ہیں۔"

"یہ میں بتاتی ہوں" شمشاد نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن حشمت نے اپنی خالہ کو جملہ مکمل کرنے ہی نہ دیا اور بولا۔

"ابو۔ بڑے ابو کی طبیعت بہت بگڑ چکی ہے۔ اس لئے میری نیناں رو رہی ہیں۔"

شمشاد نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کے سر سے بلا ٹل گئی۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی "عظمت کے ابو۔ حشمت پانچ سو روپے لینے آیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ نانا ابو کو ڈی ایچ اسپتال لے جانا ہے۔"

"کچھ دن پہلے ہی میں نے گندم بیچی تھی اور تمہیں پندرہ سو روپے دیئے تھے۔ اس میں سے پانچ سو کے بجائے ایک ہزار روپے حشمت کو دے دو۔" امیر نے بیوی سے کہا۔

پھر وہ حشمت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "بیٹا۔ ابھی گندم اور بھوسا سنبھالنے میں کئی دن لگ جائیں گے اگر مجھے فرصت ہوتی تو میں بھی تیرے ساتھ چلتا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔" "کوئی بات نہیں ہے ابو' میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

"ارے کہاں گئی ہو شمشاد" امیر نے ذرا زور سے آواز دی۔

"ابھی آتی ہوں' میں پیسے دیکھ رہی ہوں" شمشاد نے اندر سے ہی جواب دیا۔

اس کے بعد شمشاد نے ۲۰۰ روپے حشمت کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا "بیٹا ہمارے پاس دو سو روپے ہی ہیں۔"

"لیکن میں نے تو ہفتہ بھر پہلے تمہیں پورے پندرہ سو روپے دیئے تھے" امیر نے ذرا تلخی سے کہا۔

"وہ خرچ ہو گئے ہیں۔ ۹ سو روپے تو میں نے کریانہ والے کو دے دیئے تھے۔ اس کے تو ساڑھے نو سو روپے بنتے تھے لیکن میں نے نو سو روپے دے کر جان چھڑائی۔ نہیں تو وہ سودا دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور چار سو روپے عظمت کو دے دیئے۔ اس نے امتحان کی تیاری کے لئے چند کتابیں اور حل پرچہ جات خریدنے تھے" شمشاد نے حساب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن خالہ جان۔ دو سو روپے سے ہمارا کام نہیں بنے گا۔ آپ انہیں بھی رکھ لیجئے" حشمت نے سوچتے ہوئے کہا اور پیسے ماں کو دے کر گھر کو چل دیا۔

"بیٹا۔ دو سو روپے تو لے جاؤ۔ کچھ کام تو آہی جائیں گے" پیچھے سے امیر نے پکار کر کہا۔

"نہیں ابا" اس نے پیچھے دیکھے بغیر جواب دیا۔

حشمت باہر نکلا تو اس کی بہن انجمن جو اس کے انتظار میں کیکر کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ گلے لگ گئی اور شبنمی آنکھوں سے بولی۔

"بھیا۔ پیارے بھیا۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ یہ لو میرا پراٹھا اور اسے کھاؤ۔ میری قسم

اسے کھاؤ... اگر تم نے نہ کھایا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

"کیا تم خود بھوکی رہو گی؟" حشمت نے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بھیا... اپنے بھیا کے لئے بھوکا رہنے میں کیا مضائقہ ہے اور پھر بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔"

"اچھا بہن... میں تیرے حصے کا پراٹھا خود اور بابا و نانی اماں کو بھی کھلاؤں گا۔"

"سچ بھیا۔"

"ہاں بہنیا۔" حشمت نے پیار سے کہا اور بہن کے سر کو چومتا چل پڑا۔

شمشاد کے پاس پورا ہزار روپیہ تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا... شاید وہ سوتیلی ماں کا روپ دھار چکی تھی لیکن حشمت کے جاتے ہی وہ بڑبڑائی "میں کتنی بدنصیب ہوں کہ میں نے سوتیلے پن میں اپنی دخترانہ محبت کی آنکھ پر پٹی باندھ لی اور اپنے سگے باپ کے علاج کے لئے پیسے نہ دئے... میں اگلے جہاں اللہ کو کیا جواب دوں گی؟" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا شمشاد۔ اچھا نہیں کیا" امیر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ لیکن شمشاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس کی زبان پر قفل لگ چکا تھا۔

حشمت منہ لٹکائے گھر داخل ہوا تو نانی اماں سمجھ گئی کہ حشمت ناکام لوٹا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھے جاتے ہیں کے مصداق وہ اپنی بیٹی شمشاد کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شمشاد پیسے نہیں دے گی۔ لیکن پھر بھی اس نے حشمت کو بھیج دیا تھا کہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی بیماری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے رقم دے دے۔ وہ حشمت کا دل رکھنے کے لئے پیار سے بولی "بیٹا کوئی بات نہیں ہے اگر تجھے خالہ نے پیسے نہیں دیئے۔ ہم کوئی اور بندوبست کرلیں گے۔ اس جہاں میں اللہ کے نیک بندے بہت ہیں۔"

نہیں بڑی اماں۔ ہم کسی کے آگے دست دراز نہیں کریں گے... کل سے میں کام پر جاؤں گا۔ محنت مزدوری کر کے اتنے پیسے اکٹھے کروں گا کہ ابا کا علاج ہو سکے۔"

"بیٹا۔ آپ لوگ میرے لئے اتنے فکر مند کیوں ہیں۔ میں تو چند روز کا مہمان ہوں' میں نے آج شیشہ دیکھا ہے' میری ناک مڑ گئی ہے' میں بچ نہیں سکتا۔ تمہیں محنت مزدوری کرنے

کی ضرورت نہیں پڑے گی" سلطان نے صغرا اور حشمت کی آپس میں باتیں سننے کے بعد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سائیں... نہیں ابو... ایسا مت کہیے" صغرا اور حشمت دونوں نے سلطان سے لپٹ کر فریاد کی۔

"ابو۔ آپ ہزار برس جئیں" حشمت نے بھیگی آنکھوں سے کہا۔

"سلطان۔ آپ جگ جگ جئیں' آپ کی تنی ہوئی چادر کا سایہ میرے سر پر قائم رہے" صغرا نے روتے ہوئے کہا۔

"وہی ہو گا۔ جو اللہ کو منظور ہو گا" سلطان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور آنکھیں موند لیں۔

○○○

دوسرے روز حشمت مزدوری کرنے کے لئے پہنچا تو مستری اللہ رکھا نے پوچھا۔

"بیٹا۔ کیا تم مزدوری کرو گے؟"

"ہاں مستری جی۔"

"پر کیوں؟"

"اس لئے کہ بابا بیمار ہیں اور ان کے علاج معالجے کے لئے کچھ رقم درکار ہے۔"

"بیٹا جتنی رقم تمہیں چاہئے' مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں دے دیتا ہوں۔"

"نہیں مستری جی۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتا۔"

"بیٹا جی۔ میں رقم تمہیں مفت تو نہیں دوں گا۔ بلکہ وہ ادھار دوں گا۔ جب تمہارا بابا محنت مزدوری کرنے لگے گا تو پھر اس کی مزدوری سے کاٹ لیا کروں گا۔"

"نہیں مستری جی۔ میں ادھار بھی ہرگز نہیں لوں گا۔"

"لیکن بیٹا۔ چند دنوں کے اندر تمہارے سالانہ امتحان ہونے والے ہیں۔ اگر تم مزدوری کرنے لگ جاؤ گے تو پھر امتحان کی تیاری کیسے کرو گے اور امتحان کیسے دو گے؟"

"مستری چاچا۔ بابا کی بیماری بھی میرے لئے امتحان سے کم نہیں... اگر میرے بابا جی

ٹھیک ہو گئے تو میں سب امتحانوں میں پاس ہو جاؤں گا۔"

"اچھا بیٹا۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

حشمت جوان تھا' طاقتور تھا۔ پھر اس میں کام کرنے کا جوش و جذبہ بھی تھا۔ اس نے دل لگا کر کام کیا۔ مستری اس سے بہت خوش تھا۔ وہ اس کی تعریفیں کرتے تھکتا نہیں تھا۔

دس دن کی مزدوری کے بعد حشمت نے حسب منشا روپیہ کما لیا تو حشمت نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"مستری جی۔ کل میں مزدوری کے لئے نہیں آؤں گا۔"

"وہ کیوں بیٹا۔ کیا ہم سے کوئی ناراضگی ہو گئی ہے؟"

"چچا۔ آپ جیسے محسن و مہربان سے بھلا میں کیوں ناراض ہوں گا۔"

"تو پھر کیوں کام چھوڑ رہے ہو؟"

"اس لئے کہ جتنے روپوں کی مجھے ضرورت تھی وہ میں نے کما لئے ہیں۔ ابھی انشاء اللہ میں کل ہی بابا کو لے کر ڈی ایچ کیو اسپتال جہلم جاؤں گا اور ان کا مناسب علاج کراؤں گا۔"

حشمت کا جواب سن کر مستری اللہ رکھا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "شاباش بیٹا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تیرے بابا کو تندرست کرے اور تجھے ڈھیر ساری خوشیوں سے نوازے۔"

O☆O

حشمت اپنے بابا کو ڈسٹرکٹ اسپتال جہلم لے گیا۔ جہاں اس کے بابا کی کمر کی ہڈی کو سیدھا کر کے پلستر چڑھا دیا گیا۔ پلستر ٹانگوں پر بھی چڑھا دیا گیا تھا۔ دو دن حشمت کے بابا اسپتال میں رہا۔ دو دن بعد ڈاکٹر نے حشمت سے کہا۔

"اب آپ مریض کو گھر لے جا سکتے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر ہماری تحصیل پنڈ دادن خان کو جانے والی سڑک شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ کیا دھکے لگنے سے میرے بابا کو تکلیف نہیں ہو گی۔"

"ہم اس چیز کے ذمے دار نہیں ہیں۔ ہمارے پاس بستر کم اور مریض زیادہ ہیں..... ہم

نے تیرے بابا کا علاج کر دیا ہے۔ ابھی صرف ایک ماہ کے بعد پلستر کھولنا ہے اور یہ کام تمہارے اپنے شہر کے تحصیل ہیڈ کوارٹر اسپتال پنڈ دادن خان کا عملہ کر دے گا۔ اور اگر سڑک جہلم تا دادن خان ٹوٹی پھوٹی ہے تو تم بابا کو منڈی بہاؤالدین کے راستے بھی لے جا سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔"

حشمت اپنے بابا کو گھر لے آیا۔ تین دن کے بعد حشمت کا بارہویں جماعت کا سالانہ امتحان تھا۔

امتحان والی رات اس کے بابا نے کراہتے ہوئے آواز دی۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اور حشمت اپنے پہلے پرچے کیمسٹری کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اپنے بابا کی آواز سن کر فوراً پہنچا اور آہ بھر کر بولا۔ "کیا بات ہے بابا جانی؟"

"بیٹا۔ آفتابے میں پانی لاؤ اور مجھے ہاتھ منہ دھلاؤ۔"

حشمت نے جھٹ پٹ بابا کے حکم کی تعمیل کی اور بابا کا منہ ہاتھ دھلایا۔ سلطان علی نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ چند لمحات کے بعد انہوں نے ہاتھ کو نیچے کر لیا اور منہ ہلا کر حشمت کو اوپر نیچے پھونکا اور آنکھوں کو موند لیا ہمیشہ کے لئے۔

حشمت نے بابا کو بہت بلایا۔ ہلایا جلایا لیکن بابا نے جب کوئی جواب نہ دیا تو حشمت گریہ وزاری کرتے ہوئے بولا "بابا ناراض ہو گئے ہو کیا۔ کیا میں نے خدمت میں کوئی کسر چھوڑ دی ہے۔ بابا تھوڑی دیر کے لئے ہی تو پڑھنے لگ گیا تھا صبح پیپر جو تھا۔ اور بابا تم ناراض ہو گئے..... بابا جانی معاف کر دو..... معاف کر دو۔"

صغرا حشمت کی ہچکیاں سن کر جاگ پڑی اور اٹھ کر فوراً آئی اور حشمت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی "بیٹا۔ کیا بات ہے؟ کیوں آٹھ آٹھ آنسو بہا رہے ہو؟"

"بڑی اماں..... بڑے ابو ناراض ہو گئے ہیں... مجھ سے بولتے نہیں۔ انہیں کہو نا مجھ سے بولیں..... اگر بابا میرے پڑھنے پر ناراض ہیں تو میں آئندہ نہیں پڑھوں گا۔ میں انشاء اللہ

بغیر تیاری کے امتحان پاس کرلوں گا۔"

حشمت کی بات سنتے ہی صغرا نے اپنے مجازی خدا کے ماتھے پر ہاتھ رکھا جو ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ اس نے چیخ ماری "ہائے میں اجڑ گئی۔" صغرا نے گریہ وزاری کرتے ہوئے حشمت کو گلے لگالیا اور بولی "بیٹا۔ تیرا بابا تجھ سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہوگیا ہے۔ ابھی وہ میرے کہنے سے بھی تجھ سے راضی نہیں ہوگا۔"

معاً حشمت بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اڑوس پڑوس والے بھی ماں بیٹے کی آہ وبکا سن کر آگئے۔

شمشاد کو بھی پلک جھپکنے میں بابا کے مرنے کی اطلاع مل گئی۔ وہ بابل کے گھر پہنچ کر بین کرنے لگی۔ اس نے لوگوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ اس نے آہوں کا دھواں خوب چھوڑا۔ شاید اسے ضمیر ملامت کررہا ہوگا۔ کہ اس نے بابا کی خدمت نہ کی۔ وہ رات بھر روتی رہی اور دوسروں کو بھی رلاتی رہی۔

صبح نو بجے صغرا کی گریہ وزاری اور شمشاد کی سینہ کوبی کی فضا میں سلطان کا جنازہ اٹھا اور قبرستان میں لے جاکر دفنا دیا گیا۔

بابا کے مرنے کی بدولت حشمت سالانہ امتحان نہ دے سکا۔ وہ حشمت جس پر اساتذہ کرام کو ناز تھا اور جو تکیہ لگائے بیٹھے تھے کہ ان کا فطین شاگرد بورڈ بھر میں فرسٹ آکر ان کے اسکول کا نام روشن کرے گا۔

افوہ۔ وہ حشمت امتحان بھی نہ دے سکا۔ اس کی اپنی امنگوں پر بھی اوس پڑ گئی۔ ایک پھول کھلنے اور مہکنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔

○☆○

بڑے ابو کے مرنے کے بعد حشمت کی بڑی اماں صغراء بھی بیمار رہنے لگی۔ گھر میں پیسے کی پہلے ہی کال تھی۔ اماں کے علاج ودارو کے لئے کچھ چاہیے تھا۔ پیٹ کی تپش کو بجھانے کے لیے کم از کم ایک وقت کی روٹی تو چاہیے تھی۔ لہٰذا حشمت کو پھر دہاڑی کا کام کرنا پڑا۔ ویسے بھی پنجاب کے ان شہروں میں جہاں انڈسٹری وغیرہ نہیں لگی ہوئی ہوتی وہاں مزدوری

کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا حشمت کو بھی مجبوری میں ٹوکری اٹھانا پڑی۔۔۔ دہ گارے کی ٹوکری۔

افوہ۔ حشمت بے چارہ۔ ایسا گورکھ دھندے میں پڑا کہ پھر اپنا دامن چھڑا نہ سکا۔ بارھویں جماعت پاس کرلیتا بلکہ علاقہ بھر میں فرسٹ آتا اگر وہ اس سے امتحان دے سکتا۔۔ الغرض ایک ہونہار طالب علم جو زیور تعلیم سے لیس تھا۔ اسے سے کے دگرگوں حالات نے نہ تو پڑھنے کا موقع دیا اور نہ حالات سنوارنے کا۔ وہ بے چارہ کام کی دلدل میں ایسا گرا کہ پھر باہر نہ نکل سکا۔

کچھ ماہ یعنی چار ماہ بیمار رہنے کے بعد اس کی اماں صغرا ٹھیک ہوگئی۔ اسے اپنے شوہر کے گزر جانے کا بہت افسوس تھا۔ اسے وہ گھر کاٹ دوڑتا تھا جس میں اس نے اپنی زندگی کے حسین سال گزارنے تھے۔ وہ مرنا چاہتی تھی۔

لیکن جب صغرا نے اپنے مسکین نواسے کی حالت زار دیکھی کہ وہ صبح کام کو جاتا اور واپس آکر ہانڈی روٹی پکاتا۔ خود بھی کھاتا۔ اسے بھی کھلاتا اور پھر اس کی دوا لینے کے لئے چلا جاتا۔۔۔۔ جو اس کے روز کا معمول بن چکا تھا۔۔۔۔ تو اس نے مرنے کی خواہش ترک کردی۔

ایک روز حشمت دہاڑی کے لئے نکلا تو افسردہ لہجے میں بولا۔

"ماں۔ ابھی عیدالفطر قریب آرہی ہے۔ تیرے لئے نئے کپڑے بھی بنوانے ہیں۔ لہٰذا آج سے میں اوور ٹائم کروں گا۔ میں ذرا دیر سے آؤں گا۔ اگر تجھے دو تین گھنٹے کھانا دیر سے ملے گا تو ناراض تو نہ ہوجاؤ گی۔"

"نہ بیٹا۔ ہرگز نہیں" صغرا نے بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کی بعد وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوئی۔

"صغرا۔ تیرے نواسے نے تیرے لئے اپنی روپہلی زندگی کو مٹی میں ملا کر رکھا ہے۔ تیری خوشی کی خاطر اس نے دن رات ایک کررکھا ہے اور تو چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔ اری کم بخت تو ماں ہے اور وہ بیٹا۔۔۔ ماں تو اپنے لال کے لئے بچھ بچھ جاتی ہے۔ اس کی خوشی کی خاطر اپنی زندگی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اور تو مسہری پر لیٹی اپنے وفادار بیٹے کو لٹتا دیکھ رہی ہے۔ شرم

کر... کچھ حیا کر... اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ... کتنا عظیم ہے تیرا حشمت اور کتنی ظالم اور بد قسمت ہے تو۔"

جب صغرا کو اپنے ضمیر نے جھنجوڑا تو وہ ہمت کر کے اٹھی۔ سب سے پہلے اس نے مشکل سے آٹا گوندھا۔ پھر تھک گئی تو چارپائی پر جا کے لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد اٹھی۔ تیل کا چولہا جلایا اور کسی نہ کسی طرح دال پکا دی۔

حشمت جب گھر لوٹا تو ہر سو ملگجی اندھیرے کی چادر تنی تھی۔ اس نے حسب معمول دروازے کو کھولنے کے لئے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ نہ کھلا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ وہ زور سے چلایا۔

"اماں۔ بڑی اماں۔"

معاً باب وا ہوا تو اماں جھریوں بھرے چہرے پر گلاب کھلاتے بولی۔ "بیٹا جی۔ خوش آمدید۔ آج تجھے اپنی ماں سے اپنا حق ملے گا..."

پھر اس نے بڑھ کر حشمت کو گلے لگا لیا اور چوما۔ اور اسے گلے لگائے گھر کے اندر آئی اور خوشیاں بکھیرتے ہوئے بولی "بیٹا۔ جاؤ ہاتھ منہ دھو لو۔ میں تیرے لئے کھانا لگاتی ہوں۔"

"ماں۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو' کھانا کہاں سے آیا اور آج تم کیسے گھوم پھر رہی ہو۔ اپنی بیماری کا تو خیال کرو۔ اور ہاں مجھے یہ بھی بتاؤ کہ تم مجھے کون سا حق دے رہی ہو؟"

"بیٹا پہلے منہ ہاتھ دھوؤ اور آکر کھانا کھاؤ۔ پھر بتاؤں گی۔"

"اچھا ماں۔ پیاری ماں۔"

حشمت ہاتھ منہ دھو کر واپس آیا تو اس کی ماں کھانا لگا چکی تھی۔ ماں نے اس کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔ یہ تمہارا حق ہے۔ جو میں تجھے دے رہی ہوں۔ میں بھی عجب ماں ہوں کہ تیرے ہاتھوں سے نوالہ کرتی رہی۔"

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ماں۔ خدا کے لئے مت رو۔ دیکھو نا آگے ہی تم ہڈیوں کی مالا بنی ہوئی ہو اور پھر رو بھی رہی ہو۔ ماں اگر تجھے کچھ ہو گیا تو پھر سمجھ لے کہ میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔"

صغرا نے پیار بھری نظروں سے حشمت کو دیکھا۔ اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ جب اس کے دل کو ڈھارس ملی تو وہ حشمت کے منہ کو اپنے پیالہ نما ہاتھوں میں لے کر بولی "جگ جگ جیئے میرا بیٹا۔ میں اپنے بیٹے پر صدقے جاؤں' بیٹا تیری ہمت محنت اور ماں سے عقیدت فراواں نے مجھے صاحب فراش سے پیکر ہوش بنایا۔ اور میں اس قابل بنی کہ تمہیں ماں کی شفقت اور محبت کے سائے سے فیض یاب کروں۔"

پھر وہ اسے والہانہ انداز سے چومتے ہوئے کہنے لگی۔ "بیٹا۔ اب تم دیکھو گے کہ چند دنوں میں تمہاری ماں قربانی کا دنبہ بن جائے گی۔"

"ماں۔ یہ جھریاں اور یہ نقرئی بال.... آہا۔" حشمت نے عرصہ کے بعد ماں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"چل ہٹ' شرارتی" صغرا نے خوشیوں کا ہچکولہ لیتے ہوئے کہا۔

یارہویں کلاس کا دوبارہ سیشن شروع ہوا تو کالج کے پرنسپل نے چپڑاسی کو حشمت کے گھر بھیجا تاکہ وہ حشمت کو کالج کھلنے اور کلاس اٹینڈ کرنے کا بتا آئے۔

"آؤ چاچا' جی آیا نوں... آج آپ کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے کہ ہماری گلی میں آگئے۔"

حشمت نے ہنستے ہوئے چپڑاسی احمد خاں سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا" حشمت نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیسے آنا ہوا؟"

"پرنسپل صاحب نے بھیجا تھا کہ آپ کو بتا دوں کہ کالج کھل گیا ہے.... انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ کالج کے تمام اسٹاف کی مرضی ہے کہ آپ کو سلسلہ تعلیم جاری رکھنا چاہیے۔ کیونکہ آپ جیسے جوان پڑھ لکھ کر ملک کو ترقی و خوشحالی بخشتے ہیں۔"

"لیکن چچا۔ ہر ایک کی قسمت میں پڑھنا بھی تو لکھا نہیں ہوتا۔ قسمت کا دستور بھی نرالا ہوتا ہے۔ دیکھو نا عظمت اور میں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں لیکن تعلیمی مراحل کو طے کرنا اس

کے نصیبوں میں لکھا ہے جب کہ میں ذہین ترین طالب علم ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہو چکا ہوں" حشمت نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

در آں اثنا صغرا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ حشمت کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولی "ارے بیٹا۔ تم تو بڑے جری و شجاع بیٹے ہو۔ تو پھر تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

احمد خان اس کے جواب دینے سے پہلے بول پڑا۔

"بہن۔ مجھے البیرونی کالج کے پرنسپل نے بھیجا ہے۔ انہوں نے حشمت کو کالج آنے کے لئے کہا ہے۔ لیکن حشمت تو الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔"

"کیوں بیٹا۔ کیا بات ہے.... تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارے پرنسپل تمہیں کالج آنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن ماں۔ فیس کہاں سے آئے گی" حشمت نے دل مسوس کر پوچھا۔

"پرنسپل صاحب کہہ رہے تھے کہ فیس اور کتابوں کا خرچہ کالج برداشت کرے گا" احمد خان نے برجستہ جواب دیا۔

"چلو۔ تیری پڑھائی کا بڑا مسئلہ حل ہوا" صغرا نے کھلتے ہوئے کہا۔

"لیکن اماں روٹی پانی کا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ کیا ہمیں خیرات مانگنی پڑے گی۔ یا خدا چھپر پھاڑ کر ہمیں دیا کرے گا" حشمت نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

"بیٹا۔ میں اڑوس پڑوس میں جھاڑ پونچھ کا کام کر کے کم از کم ایک وقت کی روٹی کا تو بندوبست کر ہی لوں گی" صغرا نے اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا میں مر گیا ہوں.... کہ جوان بیٹے کی موجودگی میں تم لوگوں کے گھروں کا کام کرو گی.... کیا میری غیرت گوارا کرے گی کہ ہڈیوں کا ڈھانچا کام کرے اور وہ بھی ادنیٰ کام...... جب کہ ہٹا کٹا بیٹا۔ ماں کی کمائی پر گزارا کرے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے پڑھنے وڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی ماں کی خدمت کر کے جنت خریدوں گا۔ جنت.... جنت" حشمت نے ماں کے کھردرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

○☆○

حشمت مزدوری کرتے کرتے بھول گیا کہ کبھی اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ کبھی وہ اسکول جاتا تھا۔ اور پھر کالج۔ البتہ مستری اور اس کے مزدور بھائی اکثر اس کی بد نصیبی کا رونا روتے تھے۔ لیکن وہ اپنے حال میں مست مزدوری کئے جا رہا تھا اور خوشی خوشی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔

اس کے گھر سے شمال کی طرف تیسرے گھر میں تحصیل کا چپراسی فیروز خان رہتا تھا۔ اس کا بڑا مختصر کنبہ تھا۔ جوان بیٹی زاہدہ اور جوان بیوی شاہدہ۔

اس کی پہلی بیوی رابعہ اس وقت مری تھی جب زاہدہ صرف چھ ماہ کی تھی۔ اسے اپنی بیوی سے بہت پیار تھا۔ چونکہ اس وقت اس کے ماں باپ زندہ تھے۔ لہٰذا اس نے دوسری شادی نہ کی۔ جب کبھی اسے ماں سمجھاتی۔ تو وہ بپھر کر جواب دیتا۔

"بیٹا۔ رابعہ تو مر چکی ہے... ابھی وہ دوبارہ تو دنیا میں نہیں آئے گی۔ ابھی تم زاہدہ کے لئے دوسری شادی کر لو۔ زاہدہ کو ماں مل جائے گی تو اس کی دنیا میں بہار آ جائے گی۔"

"ناں ماں... نہ' میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ مجھے کوئی عورت رابعہ کا پیار نہیں دے سکتی۔ میرے سامنے دنیا کی خوب صورت سی خوب صورت عورت رابعہ کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری بیٹی سوتیلی ماں کے سائے تلے بڑھ کر جوان ہو۔ سوتیلی ماں ناگن ہوتی ہے..... ناگن...

اور پھر ماں تم بھی تو زاہدہ کی ماں ہی ہو۔ کیا تم زاہدہ کی اسی طرح پرورش نہیں کر سکتیں۔ جس طرح تم نے میری کی ہے۔

اور ہاں اگر تم اپنے آرام و سکون کے لئے میری دوسری شادی کرنا چاہتی ہو کیوں کہ ایک لوتھڑے کو سنبھالنا شاید تیرے لئے دشوار ہو تو پھر دوسری بات ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی میں دوسری شادی ہرگز نہیں کروں گا۔ بلکہ زاہدہ کو بڑی بہن کے حوالے کر آؤں گا۔ وہ اپنی دودھ پیتی بچی فاطمہ کے ساتھ اسے بھی سنبھال لے گی..."

"نہیں بیٹا... ایسا مت کہو... میں زاہدہ کو ماں کا پیار دوں گی۔ میں تو صرف چاہتی ہوں کہ تم دوسری شادی کر کے اپنے من کے تیرہ و تار گوشے میں اجالا بکھیر لو۔"

"میں نہیں کروں گا دوسری شادی۔ ماں تم سمجھتی کیوں نہیں ہو" فیروز قدرے غصے میں کہتا اور بے چاری ماں چپ کا روزہ رکھ لیتی۔

لیکن جب فیروز کا باپ مر گیا اور دو ماہ کے بعد ماں بھی مر گئی تو پھر فیروز کے لئے زاہدہ دردِ سر بن گئی۔ وہ گھر کا کام کاج بھی کرتا اور زاہدہ کو بھی سنبھالتا۔ صبح سویرے اٹھتا' ناشتا تیار کرتا۔ زاہدہ کو جگا کر اسے کھلاتا۔ پھر اس کے اسکول جانے کا وقت ہو جاتا اور وہ اسکول چلی جاتی۔ وہ اس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اور دس بہاریں دیکھ چکی تھی۔

زاہدہ کو اسکول بھیجنے کے بعد وہ کچہری اپنے کام پر چلا جاتا۔ زاہدہ کی چھٹی ہونے سے پہلے اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی اور وہ گھر آکر کھانا وغیرہ تیار کر لیتا۔ دریں اثنا زاہدہ آجاتی اور وہ مل کر کھانا کھالیتے۔

فیروز کی عمر بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ کچہری کا کام الگ اور گھر کا کام بھی.... پھر زاہدہ کی خاطر داری اسے تھکا دیتی۔ تو وہ سوچتا کہ اس نے شادی نہ کر کے فاش غلطی کی تھی اور شادی نہ کرنے کا احساس زیادہ اسے اس لئے بھی ستا رہا تھا کہ ان دنوں اس کی ملاقات دربار میں ایک دھان پان سی لڑکی سے ہو گئی تھی۔ سپید رنگ' لمبا قد' لمبے بال' جھیل نما آنکھیں اور سڈول جسم شاہ ناز۔

شاہ ناز اپنے والد کے ساتھ دربار میں خاوند سے طلاق لینے کے سلسلہ میں آتی تھی۔ وہ تھی تو ان پڑھ لیکن وہ دنیا کے رکھ رکھاؤ جانتی تھی۔ خاص کر اسے مرد کو مٹھی میں لینے کا گر آتا تھا۔

ایک روز وہ فیروز سے لبوں پہ ہنسیاں سجائے متکلم ہوئی "سنا ہے کہ تم تحصیلدار صاحب کے چپڑاسی ہو اور رشوت رسیا بھی ہو۔ ارے ہم سے رشوت لے کر ہمارا بھی کام کرادو۔"

"پہلے کام تو بتاؤ" فیروز نے اسے چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے خاوند سے طلاق لینے کا دعویٰ دائر کر رکھا ہے۔ کئی پیشیاں بھگت چکی ہوں۔ لیکن ہر بار دوسری تاریخ مل جاتی ہے اور فیصلہ ہو نہیں پاتا۔ آج اپنے وکیل صاحب سے پتا چلا کہ تم بڑے کام کے آدمی ہو۔ اس لئے تمہاری طرف کشاں کشاں چلی آئی۔" شاہ ناز نے

بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

دونوں ایک دوسرے کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ کچھ لمحات کے بعد شاہ ناز نے شرما کر آنکھیں جھکالیں تو فیروز چاہت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"ٹھیک ہے ملکہ عالیہ۔ ہم تمہارے مقدمے کا جلد فیصلہ کرا دیں گے۔"

"تم نے مجھے ملکہ عالیہ کہا" اس نے نشیلی آنکھوں سے فیروز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میرے دل کی ملکہ" اس نے آنکھ کے اشارے سے جواب دیا "اوکے" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ شاد تھی کہ اس نے اپنے دل ربا غمزوں واداؤں سے اپنا نشانہ ٹارگیٹ پر داغ دیا تھا۔

اور پھر کچہری میں فیروز اور شہناز کی اکثر ملاقات ہو جاتی۔ وہ دونوں باپ بیٹی کی خاطر تواضع بھی کر دیتا۔ اور محبت کی دو چار باتیں بھی کر لیتا۔

فیروز کی کوششوں سے مقدمہ کا فیصلہ شہناز کے حق میں ہو گیا۔ اس وقت تک وہ دونوں پیار کے حصار میں بند ہو چکے تھے۔ طلاق کے بعد وہ زندگی کے قفس میں بھی بند ہو گئے۔

شہناز نوخیز کلی تھی اور فیروز مرجھایا ہوا پھول۔ اس میں خوشبو تو تھی ہی نہیں تو پھر وہ شہناز کی مچلتی اور اچھلتی آرزوؤں کے من کو کیسے مہکا سکتا تھا۔ وہ بے چارہ مجبور تھا۔ اور شہناز بھی مجبور تھی۔

اور پھر وہی ہوا جو جوان لڑکی اور بوڑھے مرد کی شادی سے اکثر ہوتا ہے۔ شہناز کسی من چلے کے ساتھ بھاگ گئی اور فیروز کی دنیا اجاڑ گئی۔

○☆○

فیروز کے محلے میں ایک درمیانی عمر کی بیوہ رہتی تھی۔ وہ بلیک بیوٹی تھی لیکن طلاق اس کے لئے کلنک کا ٹیکہ بن چکا تھا۔ اس کی عمر ڈھل رہی تھی لیکن کوئی اس کے لئے شادی کا پیغام لے کر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی بھائی کی نوکرانی بن کر زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ وہ فیروز کی تاک میں تھی۔ جب اس کی بیوی شہناز بھاگ گئی تو اس نے ایک محلے کی ہمدرد عورت کو مٹھی میں لیا اور اسے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بھاگ بھری بہن۔ میں کانٹوں پر سو کر زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔ میرا بھائی تو جورو کا غلام ہے۔ اسے میری کچھ خبر نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھار تو وہ بیوی کی باتیں سن کر گالیاں بھی دے دیتا ہے۔ جب کہ تم جانتی ہو کہ میں اس کی بڑی بہن ہوں اور بہن ماں کے برابر ہوتی ہے۔"

میں اس کانٹوں بھری زندگی سے نجات چاہتی ہوں اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ میری شادی ہو جائے ... برسوں سے انتظار کر رہی ہوں کہ شادی ہو۔ لیکن افسوس میری آرزوؤں کا پھول نہ کھل سکا۔ اب تو میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہوں لیکن اب مجھے ڈھارس سی بندھی ہے لیکن اس صورت میں بھی مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

بھاگ بھری اس کی دکھ بھری داستان سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"شبانہ بہن۔ میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتی ہوں؟"

جب شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پھر پیار سے پوچھا۔

"بہن۔ جب تم مجھے کچھ بتاؤ گی ہی نہیں تو پھر میں کس طرح تمہاری مدد کروں گی۔"

اس نے شرما کر جواب دیا "مجھے شرم آتی ہے۔"

اس نے ہنس کر دوبارہ پوچھا "پہلے حیا کی ندی میں غوطے کھالو۔ پھر مجھے بتا دینا ابھی تھوڑی جلدی میں ہوں' اب میں جاتی ہوں۔"

"اری بھاگ بھری۔ میری بات تو سن لے' پھر چلی جانا۔"

"تو پھر بتا۔"

"وہ ہے نا فیروز نہ۔"

"رک کیوں گئی ہو۔ بتاؤ' جب محرم راز بنا ہی لیا ہے تو پھر ندامت کا پردہ بھی اتار پھینکو۔"

"فیروز کی بیوی کسی جوان لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میرے خیال میں اس نے ٹھیک ہی کام کیا ہے۔ بھلا جوان لڑکی اور عمر ڈھلے سے مرد کا کیا جوڑ..."

فیروز نے شہناز سے شادی کر کے غلطی کی تھی۔ فاش غلطی۔ جس کا خمیازہ وہ بھگت رہا ہے۔"

"لیکن تمہیں فیروز کا غم کیوں کھائے جا رہا ہے؟" بھاگ بھری نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"اری بھاگ بھری پہلے پوری بات تو سن ... پھر اپنی ٹانگ اڑانا۔ تو ہاں میں کہہ رہی تھی کہ فیروز نے شہناز کے ساتھ شادی کر کے فاش غلطی کی تھی۔ وہ ضرور پچھتا رہا ہوگا۔ لیکن اب پچھتائے کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

"اس کا جوڑ اور میرا جوڑ صحیح رہے گا۔"

"ہیں۔ ہیں' یہ تم نے کیا کہہ دیا" بھاگ بھری نے حیران ہو کر پوچھا۔

تو شبانہ روہانسی ہو کر بولی "بہن میں نے صحیح کہا ہے۔ اب مجھے سنہری موقع ملا ہے۔ اگر یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ تو پھر میرے ہاتھ کبھی بھی پیلے نہ ہوں گے۔ ابھی لوہا گرم ہے۔ فیروز غموں کی بھٹی میں گرم ہو رہا ہے' ابھی اگر اس پر ضرب لگائی جائے تو وہ نرم ہو جائے گا۔ میری آرزو ہے کہ تم اس کے گھر جاؤ اور اسے میری تعریفوں کے پل باندھ کر کنونس کرو کہ وہ میرا رشتہ میرے بھائی سے مانگے۔"

"اوہو۔ بہن آنسو مت بہاؤ۔ یہ تو میرے لئے معمولی کام ہے۔ میں آج ہی فیروز کے گھر جاؤں گی" بھاگ بھری نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو مائی سسٹر" شبانہ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اور پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق فیروز اور شبانہ کی شادی ہو گئی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں جہاندیدہ تھے۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ بالکل لیلیٰ اور مجنوں کی طرح۔

○☆○

شبانہ کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ اسے زاہدہ کے روپ میں باندی مل گئی۔ وہ بارہ سال کی ہو چکی تھی اور کلی سے پھول بھی بن چکی تھی۔ لیکن مرجھایا ہوا پھول۔ بے چاری پلی تو ناز و نعم سے۔ دادی اور باپ نے اس کی پرورش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن دس سال کی عمر میں اس کے گلستان میں خزاں داخل ہو گئی۔ شاہ ناز کے روپ میں اور بارہویں

سال میں داخل ہوئی تو شبانہ ماں بن کر آ گئی۔ پکی سوتیلی ماں بن کر۔

شبانہ کی قسمت کا ستارہ تو عروج پر چمکنے لگا۔ خاوند الگ ناز نخرے اٹھاتا۔ باندی ہر قسم کے کام کرتی۔ جھاڑو دیتی۔ برتن صاف کرتی۔ کپڑے دھوتی وغیرہ جبکہ شبانہ صرف ہانڈی روٹی پکاتی۔ وہ بھی اس لئے کہ ایک تو زاہدہ کی عمر روٹی پکانے کی تھی بھی نہیں۔ دوسرا اللہ بخشے اس کی دادی مرحومہ کو کہ جس نے اسے شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ ہانڈی روٹی پکانا تو کجا وہ تو اس سے گھر کا چھوٹا موٹا کام بھی نہ کراتی تھی۔ اس کا کام صرف ہم جولیوں سے کھیلنا اور اسکول جانے کا تھا۔ دادی کے ہاتھوں سے روٹی کھانے کا۔

سوتیلی ماں کے آنے سے زاہدہ کی زندگی میں یکسر انقلاب آ گیا۔ اس کا باپ بھی سوتیلا بن گیا۔ شروع شروع میں اس کا باپ اس کی خبرگیری کرتا رہتا۔ اس سے پیار بھی کرتا اور اس سے دکھ سکھ کی باتیں بھی کرتا لیکن آہستہ آہستہ اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ اگر وہ کبھی بات بھی کرتا تو اس وقت جب اسے بات کرنے کی ضرورت پڑتی۔ مثلاً "زاہدہ بیٹی۔ ذرا پانی تو پلا دینا۔۔۔ بیٹی ذرا پاؤں تو دبا دینا۔ سر دبا دینا وغیرہ وغیرہ۔"

شبانہ شروع شروع میں تو زاہدہ سے اس وقت کام کراتی تھی۔ جب فیروز گھر نہ ہوتا۔ لیکن جب اس نے فیروز کو مکمل طور پر اپنی مٹھی میں لے لیا تو وہ ہر قسم کا کام اس سے کرانے لگی۔ وہ تو منہ رکھنے کے لئے بھی کبھی نہ کہتا "اری شبو۔ زاہدہ تو کلی ہے کچی کلی ہے۔ اس سے زیادہ کام نہ کراؤ۔ کہیں یہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا نہ جائے۔"

افوہ۔ زاہدہ کولہو کا بیل بن چکی تھی۔ وہ ہر وقت کام میں جتی رہتی۔ اس کے گھر میں لگا بیر کا درخت اس پر بیٹھنے والے پرندے۔ اس کے ساتھ بندھی ہوئی گائے اور اقارب وغیرہ اس کی بدنصیبی پر افسوس وغیرہ کرتے رہتے۔ لیکن اگر کسی کو اس پر ترس نہ آتا تھا۔ تو وہ صرف فیروز و شبانہ تھے۔ فلک بھی اس کی قسمت پر مسکرا کر تبسم افشانی کرتا تھا۔

حشمت تو اس نصیبوں جلی پر آتاہ دل سے ماتم کناں تھا۔ وہ اکثر بلکہ دن میں دو تین بار ان کے گھر آتی اور اس کی بڑی اماں سے سوال کرتی "اماں جان۔ تھوڑا نمک چاہیے۔"

کبھی دست سوال دراز کرتی "دادی اماں۔ پیاز چاہیے۔"

کبھی کبھی دادی اماں تنگ آ کر اس پر پھنکار برساتی "تمہارے گھر میں لون، مرچ مصالحہ جات وغیرہ کی کال ہی رہے گی کیا۔۔۔ اپنے باپ کو کہو کہ وہ ان کو خرید کر گھر میں رکھا کرے۔ ہمارے گھر میں قارون کا خزانہ دفن نہیں ہے کہ ہم ہر روز تمہاری کسی نہ کسی چیز کا مطالبہ پورا کرتے رہیں۔"

زاہدہ بڑی ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر مرجھائے ہوئے دل سے کہتی "دادی اماں۔ بے شک مجھے طنز کے تیر مار لو۔ لیکن مجھے خالی ہاتھ نہ جانے دینا۔ نہیں تو مجھے ماں ڈنڈے سے مارے گی۔"

تو حشمت کی دادی ماں کو پھر اس پر ترس آ جاتا اور وہ اسے پیار سے کہتی "صدقے جاؤں میں زاہدہ پہ۔۔۔ اپنی پیاری بیٹی پہ۔ تمہارے لئے تو میں آسمان سے تارے بھی نوچ لاؤں۔۔۔ تم تو میری اپنی بیٹی ہو، اپنی بیٹی۔"

پھر وہ مسکرا پڑتی اور مطلوبہ چیز لے کر چلی جاتی۔

یک روز زاہدہ آئی تو صغراء گھر میں نہیں تھی۔ وہ سودا سلف لینے بازار گئی ہوئی تھی۔ اس کے دروازہ کھٹکھٹانے پر حشمت نے کنڈی کھولی۔ ابھی اس نے ایک قدم ہی دہلیز سے اندر رکھا تھا کہ حشمت بولا "زاہدہ۔ بڑی اماں تو گھر میں نہیں ہیں۔۔۔۔ اگر تمہیں کوئی چیز چاہیے تو مجھے بتاؤ میں دیئے دیتا ہوں۔"

"مجھے چمچ بھر سرخ مرچیں چاہئیں" زاہدہ نے اوپر دیکھے بغیر کہا۔

"اچھا تم یہاں باہر ہی ٹھہرو۔ میں تجھے مرچیں لا دیتا ہوں" حشمت نے میٹھی آواز میں کہا۔ حشمت آناً فاناً مرچیں لے آیا اور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"یہ لو۔ مرچیں۔"

زاہدہ نے پہلی دفعہ حشمت کی طرف دیکھا اور وہ بھی محبت بھری آنکھوں سے اور پھر شرما کر بھاگ گئی۔

زاہدہ گدڑی میں چھپا لال تھی۔ وہ پھٹے اور پرانے کپڑے پہنے رکھتی اور کبھی میک اپ نہ کرتی۔ اس کے بال بھی الجھے الجھے رہتے۔ شاید اسے کنگھی کرنے کا بھی شوق نہ تھا۔

اس دن بھی حسب معمول اس نے گندے کپڑے ہی پہن رکھے تھے۔ سر پر گز بھر چنی اوڑھ رکھی تھی لیکن اس میں بھی جگہ جگہ سوراخ تھے۔

لیکن اس دن نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے مست بھری آنکھوں سے حشمت کو دیکھ لیا۔

اور پھر کیا ہوا..... حشمت کے دل میں اس کے پیار کا کنول کھل اٹھا۔ وہ جب شرما کر گھر کی طرف بھاگے جارہی تھی تو اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ آکاش سے اتری اپسرا جارہی ہو۔ اس کا دل چرا کر.....

اس دن کے بعد جب بھی انہیں ملنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت ضرور کی اور اگر بات کا چانس نہ ملتا تو وہ محبت بھرے غمزوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

صغرا نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ حشمت اور زاہدہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے ہیں۔ اور وہ خوش تھی کہ اس کی ہونے والی بہو شرافت و عزت کا پتلا تھی۔

حشمت اور زاہدہ دونوں کا پیار سچا پیار تھا۔ انہوں نے کبھی بھول کر بھی شرافت و انسانیت کے حصار سے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ پیار سے پیار کئے جارہے تھے کہ کبھی سچ مچ ایک جان دو قالب بن کر زندگی کے بقیہ دن ہنسی خوشی گزاریں گے۔"

○✡○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ عظمت لاہور ہائی کورٹ میں ایک کامیاب وکیل بن چکا تھا۔ لاہور کے نواحی علاقہ جات میں اس کی شہرت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک قتل کا مقدمہ آیا۔ کرنل جمشید کے بیٹے نوید کے ہاتھوں اپنے نوکر کا قتل ہوگیا تھا۔ عظمت نے اپنی لیاقت کے بل بوتے پر نوید کو قتل کے مقدمے سے بری کرا دیا۔ کرنل جمشید خوش ہو کر اسے منہ مانگی رقم سے نوازا۔

ایک روز جمشید کے بلانے پر عظمت ان کے گھر میں گیا۔ انہوں نے اس کی شاندار

دعوت ضیافت کی تھی۔ دوران کھانا جمشید صاحب کی اکلوتی بیٹی نیلم اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ نیلم بہت ہی خوب صورت لڑکی اور ایم اے پاس تھی۔ وہ کھل کھل کر عظمت سے باتیں کررہی تھی۔ اور عظمت کے خاندان کے متعلق پوچھ رہی تھی اور عظمت بغیر لگی لپٹی اپنے حالات سے پردہ کشائی کر رہا تھا۔

دعوت طعام ختم ہوئی تو کرنل جمشید کی پوری فیملی نے گیٹ سے باہر آکر اسے خدا حافظ کہا۔ گھر میں واپس آتے ہی کرنل جمشید نے اپنی بیٹی کو اپنے بیڈ روم میں بلا کر چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بیٹی۔ عظمت کیسا لڑکا ہے۔ میں نے اسے تمہارے لئے پرپوز کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آج اسے میں نے گھر میں کھانے پر بلایا تھا تاکہ تم دیکھ لو اور اس سے باتیں کرکے اس کی شخصیت کو پرکھ لو۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس سے تمہارے رشتے کی بات کروں۔"

نیلم نے باپ کی بات سن کر سر جھکا لیا معاً اس کی ماں عائشہ بھی اندر آگئی۔

جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "اری بھاگوان۔ بڑے اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں نیلم سے پوچھ رہا تھا کہ اسے وکیل عظمت پسند ہے کہ نہیں؟ لیکن شاید اسے ہماری پسند..... پسند نہیں ہے تب ہی تو جواب دے نہیں رہی۔"

"بیٹی۔ اپنے بابا کو جواب دو۔ ہم تمہاری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہم وہی کریں گے جسے ہماری چہیتی بیٹی پسند کرے گی" عائشہ نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اماں..... اماں۔"

"ہاں۔ بیٹی کچھ بولو تو سہی۔"

"اماں جی۔ مجھے ابو جی کا فیصلہ منظور ہے" نیلم نے دھیرے سے کہا اور شرما کر کمرے سے چلی گئی۔

○✡○

کچھ دن ہی بیت پائے ہوں گے کہ کرنل جمشید وکیل کے آفس میں داخل ہوا۔ عظمت

جمشید صاحب کو دیکھ کر متحیر تو ہوا لیکن اس نے اٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا "ویلکم کرنل جمشید صاحب۔ ویلکم۔"

"جیتے رہو بیٹا" جمشید نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"چائے چلی گی یا ٹھنڈا" عظمت نے پوچھا۔

"بیٹا۔ آج تجھ سے گرم گرم باتیں ہوں گی۔ لہٰذا گرم گرم باتوں کے ساتھ مشروب بھی گرم ہونا چاہیے۔ چائے ٹھیک رہے گی۔"

"اوکے کرنل صاحب۔"

عظمت نے چپڑاسی کو چائے کا آرڈر دے دیا اور خود کرنل صاحب سے ہم کلام ہوا "کیا میں جکان سکتا ہوں کہ آج عزت ماب ہمارے دفتر میں کیسے آئے ہیں؟"

"وکیل صاحب۔ اس بات کا جواب تو میں چائے کا گرم گرم گھونٹ بھرنے کے بعد ہی دوں گا۔"

"واہ کرنل واہ۔ آپ نے چائے یاد کی اور چائے بھی آگئی" عظمت نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور چپڑاسی نواز کو کرنل صاحب کو چائے جلد پیش کرنے کو کہا۔ جب نواز نے چائے رکھ دی تو عظمت بولا۔

"اچھا نواز۔ اب تم جاؤ۔"

اس کے بعد عظمت نے بڑے پیار سے پوچھا "پیار سے پوچھتا بھی کیوں نہ۔۔۔ وہ تو خود نیلم کو اپنے دل کے مسکن میں آباد کر چکا تھا۔ تو ہاں کرنل صاحب۔ اب بتائیے کہ آپ کس لئے ہمارے غریب کدے پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کہ میرے دل میں اجالا بکھر گیا ہے۔"

کرنل صاحب نے بھی پیار بھرے لہجے میں جواب دیا "وکیل صاحب۔ میں واقعی آپ کے دل کی ننھی دنیا کو روشن کرنے ہی آیا تھا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے تسلیم کر لیا۔ میں اپنے ساتھ نیلم کے پیار کی شمع لایا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ شمع ہمیشہ تیرے دل میں کرنیں بکھیرتی رہے۔ [illegible] منظور ہے"

وکیل عظمت نے جھٹ کھلتے جواب دیا "غلام کو آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔"

"آہا۔ پھر تو میرے من کا آنگن بھی روشن ہو گیا۔" کرنل صاحب نے مسرور ہو کر جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" عظمت نے پوچھا۔

"عزیزم۔۔۔ اب میں تمہیں عزیز کہاؤں گا۔ وہ اس لئے کہ تم نے میرے ہر فیصلے کو قبول کرنے کی حامی بھر لی ہے۔"

"لیکن آپ کچھ ارشاد فرمائیں تو سہی"

"میں تمہیں نیلم کا رشتہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن نیلم کو پانے کے لئے تجھے بھی کچھ قربانی دینی ہوگی۔"

"وہ کیا؟"

"ایک تو تمہیں مکان لاہور میں بنانا ہوگا۔"

وہ تو میں پہلے ہی آصف پلازا گلشن اقبال میں خرید چکا ہوں۔ پورے بارہ لاکھ میں۔"

"بہت خوب" تم نے دل ہی خوش کر دیا۔ کرنل خوشیوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی کوئی آپ کی خواہش ہے" عظمت نے پوچھا۔

"ہے تو سہی۔۔۔ صرف ایک اور" کرنل صاحب نے رک رک کہا۔

"آپ تکلف مت کیجئے فی البدیہہ کہہ دیجئے۔۔۔ مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہوگی" عظمت نے ہنس کر جواب دیا۔

"پیارے عظمت۔ ہمارا سوسائٹی میں مقام ہے۔ توقیر ہے۔ جب کہ آپ۔۔۔"

"کرنل صاحب۔ سوچئے مت۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا تامل کہہ دیجئے۔" عظمت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ ہمارا سوسائٹی میں مقام ہے جبکہ آپ لوگوں کا اسٹیٹس اتنا اونچا نہیں ہے۔"

کرنل صاحب نے ذرا مبالغے سے کام لیا ورنہ عظمت کا خاندان بہت غریب تھا۔ ان کا

سوسائٹی میں کوئی مقام نہ تھا۔

کرنل لمحاتی سکوت کے بعد گویا ہوا "میں چاہتا ہوں کہ آپ نیلم کو مجبور نہیں کریں گے کہ وہ آپ کے ساتھ آپ کے قصبے میں جائے اور آپ کے اعزا و اقارب کے سکھوں میں شریک ہو۔"

کرنل صاحب سکھوں کے ساتھ دکھوں کا لفظ بھی کہنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے بصیرت سے کام لیتے ہوئے ایسا نہ کہا۔

عظمت سوچ بچار میں پڑ گیا تو کرنل صاحب نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "پیارے عظمت۔ سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو۔ جواب دو، اور ہاں اگر نیلم اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ جانا چاہے گی تو پھر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"آپ کا یہ فیصلہ بھی مجھے منظور ہے۔ میں نیلم کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا" عظمت نے خوش ہو کر کہا۔ عظمت کو یقین تھا کہ جب نیلم کی شادی ہو جائے گی تو وہ بھی دوسری مشرقی عورتوں کی طرح خاوند کی ہر خواہش پر اپنے سر کو جھکا دے گی۔

اور پھر عظمت اور نیلم کی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ پانچ سو کے قریب مہمانوں کو مدعو کیا گیا جس میں عظمت کے رشتے دار صرف تین تھے۔ ایک اس کا باپ امیر علی، ماں شمشاد اور بہن انجمن...

اور وہ بھی تینوں دوسرے دن واپس آ گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ چمکتی داونچی فضاؤں میں اپنے آپ کو ایڈ جسٹ بھی نہ کر پائے تھے۔

نہ ہی عظمت نے انہیں روکنے کی کوشش کی کیونکہ وہ بھی ان کی موجودگی کو اپنی ہتک سمجھ رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ ان شرفاء میں بالکل پینڈو لگتے تھے۔

شادی کے بعد امیر و شمشاد اپنے بیٹے کے پاس لاہور دوبارہ گئے لیکن نیلم نے ان کی ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا۔ حتیٰ کہ ایک روز نیلم کا کزن اس کے گھر آیا اور اس نے سٹنگ روم میں شمشاد کو میلے کچیلے کپڑوں میں بیٹھے دیکھا تو اس نے پوچھا "نیلم۔ یہ عورت کون ہے؟"

"یہ ہماری خادمہ ہے" شمشاد اپنی بہو کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی لیکن کچھ نہ بولی۔

"تو پھر صوفے پر کیوں بیٹھی ہے؟"

"نئی نئی ہے۔ بڑے گھروں کے آداب نہیں جانتی" نیلم نے طنز کا دوسرا تیر چلایا۔ تو شمشاد اٹھ کر چلی گئی۔ بلکہ اسی دن اپنے میاں کو لے کر اپنے گاؤں واپس آ گئی۔ اس کے بعد وہ میاں بیوی دونوں مرتے دم تک اپنے بیٹے کے پاس لاہور نہیں گئے۔

شروع شروع میں ماہ دو ماہ بعد عظمت اپنے گاؤں آ کر ماں باپ کو مل جاتا لیکن آخر میں اس نے آنا جانا قطعی بند کر دیا۔ کیونکہ اس کا اسٹیٹس بہت اونچا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان پینڈوؤں کی وجہ سے دوستوں میں اس کی بے عزتی ہو۔ وہ اپنے اوپر مغربی رنگ و روپ کا ملمع چڑھا چکا تھا اور اس کی بیگم نیلم تو پلی بڑھی ہی مغربی ماحول میں تھی۔

○☆○

شمشاد کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ حشمت کو تو شروع سے ہی اس نے بیٹا سمجھا ہی نہیں تھا۔ لے دے کے ایک ہی بیٹا عظمت رہ جاتا تھا۔ جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے اسے سکھ دینے کے بجائے غم ہی غم دیئے تھے۔ وہ اپنے بیٹے عظمت کے غم میں جلتی و کڑھتی رہتی۔ وہ سوکھ کر تنکا بن گئی تھی۔

امیر اسے لاکھ سمجھاتا لیکن اس پر رتی بھر اثر نہ ہوتا۔

"اری بھاگوان۔ تو جل جل کر کیوں بھسم ہو رہی ہے۔ کیا تیرے جلنے سے عظمت سیدھے راستے پر آ جائے گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تو پھر بہتر نہیں ہے کہ تو یہی سمجھ کہ تجھے اللہ نے بیٹا دیا ہی نہیں تھا۔ تجھے صرف ایک ہی بیٹی دی تھی۔"

تو وہ دل کو مسوس کر کہتی "نہیں امیر نہیں۔ عظمت میرا بیٹا ہے۔ شاید اللہ مجھے میرے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ میں نے اپنے باپ سلطان کی قدر نہ کی حتیٰ کہ اسے علاج کے لئے معمولی سی رقم بھی نہ دی۔ آج میں مکافات عمل کی چکی میں پس رہی ہوں۔ اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں۔ اگر میں اپنے ماں باپ کی قدر کرتی تو آج میں بھی اپنے لگائے ہوئے آم کے پیڑ سے آم کھا کر منہ میٹھا کر رہی ہوتی....

اللہ تعالیٰ دنیا میں انسان کو کیے کی سزا دیتے ہیں۔ سزا وار جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے اور دیکھنے والے اسے سزا کاٹتے دیکھ کر عبرت پکڑتے ہیں اور دنیا کو جنت بنا لیتے ہیں۔ لیکن جن کی قسمت میں کانٹے چننا ہی لکھے ہوتے ہیں وہ کسی کو تڑپتا دیکھ کر بھی ملول نہیں ہوتے اور اپنی دنیا میں مگن اپنے غلط راستے پر چلتے رہتے ہیں اور اپنی عاقبت بگاڑ لیتے ہیں۔

میں بھی ان منحوس وملعونین میں سے ہوں۔" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔

رات کے پچھلے پہر آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ گھپ اندھیرا چھایا تھا۔ بادل گرج گرج کر شمشاد بیگم کو خوف زدہ کر رہے تھے۔ وہ مہیب آوازوں کو سن کر کانوں میں انگلیاں دبائے گھر میں ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ اس نے کوٹھری میں جا کر لحاف اوڑھ لیا لیکن پھر بھی کرخت آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

"شمشاد بیگم۔ تم چڑیل ہو۔ تم ناگن ہو' تم نے اپنی بہن ارشاد کو ڈسا۔ اپنے بیٹے کو ڈسا اور پھر اپنے باپ کو ڈنگ مارنے سے باز نہ رہی' تم عقرب ہو' الاقارب کالعقارب مثال تم پر فٹ بیٹھتی ہے۔"

"نہیں۔ نہیں" اس نے زور سے چیخ ماری۔ اور اس کی چیخ کو سن کر امیر اور انجمن بھاگے بھاگے وہاں پہنچے۔ ان کی گہری نیندیں اڑ چکی تھیں۔ وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے "کیا ہوا شمشاد' کیا ہوا امی۔"

لیکن اس وقت تک شمشاد کی دنیا لٹ چکی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ معذور ہو چکی تھی۔ اس کے دل سے ہوک سے اٹھتی "ہائے اللہ۔ میں مر گئی۔۔۔۔ میں مر گئی۔"

شمشاد کی آہ آہ سن کر امیر اور انجمن دونوں باپ بیٹی کے دل کرچی کرچی ہو گئے۔ انجمن نے تو فرط غم سے سینہ پیٹ لیا۔

○☆○

صغرا کو اپنی بیٹی کی حالت زار کا پتا چلا تو اس نے جوتی بھی نہ پہنی اور حشمت کو لے کر پہنچ گئی۔ بڑھاپے میں ایک اور غم کا تیر اس کے ناتواں بدن میں آلگا۔ اس نے صبر سے وہ بھی سہہ لیا۔ وہ ہمہ تن اپنی بیٹی کی تیمارداری میں لگ گئی۔

آہ۔ بے چاری شمشاد کی قسمت میں صحت یابی لکھی ہی نہیں تھی۔ وہ تو چارپائی کی ہو کر رہ گئی۔ صغرا بے چاری روٹی ہانڈی میں جت گئی۔ انجمن بھی نانی اماں کی بھرپور مدد کرتی۔ حشمت ابو کے گھر سے ہی صبح کام پر چلا جاتا اور کام ختم ہونے کے بعد واپس آجاتا اور اپنی بہن کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھاتا۔

انجمن بھی اس وقت تک روٹی نہیں کھاتی تھی جب تک حشمت واپس نہ آجاتا۔ جب حشمت واپس آتا تو انجمن کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ وہ بسم اللہ بسم اللہ کر کے بھیا کے ہاتھ دھلاتی اور جھومتے جھامتے روٹی سالن لے آتی۔ پہلا لقمہ اپنے ہاتھوں سے بھیا کو کھلاتی۔ حشمت بھی پہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے اسے کھلاتا اور پھر دونوں خوشی خوشی روٹی کھانے لگ جاتے۔ جبکہ شمشاد چارپائی پر لیٹے دور سے انہیں روٹی کھاتے دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں پانی بھر بھر جاتا۔ شاید وہ سوچتی ہو گی "کاش حشمت کی جگہ عظمت ہوتا۔"

عظمت کو بذریعہ تار ماں کی بیماری کی اطلاع دی گئی لیکن وہ اکیلا ڈیڑھ ماہ کے بعد آیا اور پھیکا ہو کر بولا "ماں۔ تیری بیماری کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں عین وقت پر نہ آسکا۔ کیونکہ ان دنوں میرے کندھوں پر ان گنت مقدموں کا بوجھ تھا۔ ابھی مشکل سے انہیں نمٹا کر آیا ہوں۔"

دو دن رہنے کے بعد اپنے ابو سے بولا "ابا جانی۔ لاہور میں نیلم اکیلی ہے۔ میں آیا تھا تو حمیرا کو بخار بھی تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چلا جاؤں۔"

"ہاں بیٹا۔ تمہیں چلا جانا چاہئے۔ حمیرا بیمار جو ہے۔ اگر کچھ ہو گیا تو پھر نیلم تجھے معاف نہیں کرے گی" امیر نے دل مسوس کر کہا۔

اور تب عظمت سب کو مل کر لاہور چلا گیا۔ اس کو الوداع کہنے کے لئے حشمت اور انجمن دونوں ریلوے اسٹیشن پر آئے۔

انجمن نے تو گلے لگ کر روتے ہوئے بھائی سے کہا "بھیا' کبھی کبھار آکر مل جایا کرو۔"

"ہاں بہنیا۔۔۔۔ میں ضرور آیا کروں گا" اس نے جھوٹی تسلی دی اور چلتی ہوئی گاڑی میں چڑھ کر انجمن اور حشمت کو الوداعی ہاتھ لہرائے اور آکر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجمن اور حشمت

اس وقت تک پلیٹ فارم پر کھڑے رہے جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

○☆○

صغرا کے کندھوں پر بڑا مشکل کام آ پڑا تھا۔ اسے رات دن پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ بیمار بیٹی کو سنبھالنا اور گھر کا کام کاج کرنا۔ انجمن بھی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ لیکن انجمن جوان تھی اور فکر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ جبکہ صغرا کی زندگی کا آنچل تو دکھوں، غموں اور بڑھاپے کی باڑ میں الجھا ہوا تھا۔ وہ شمشاد بیٹی کو کراہتے ہوئے دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتی۔ اس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔

ایک روز شمشاد نے روتے ہوئے امیر سے کہا "میں چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی انجمن کے ہاتھ پیلے ہوتے ہوئے دیکھ سکوں۔"

امیر نے روہانسا ہو کر کہا "بات مشکل نہیں ہے لیکن بات تو پیسوں کی ہے۔ اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو سورج چڑھنے سے پہلے بیٹی کی شادی کر دیتا لیکن میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔"

"عظمت سے مدد کیوں نہیں لیتے؟"

"کیا کہا۔ عظمت سے مدد۔ اس بیٹے سے مدد لوں۔ جسے ہماری کچھ پروا نہیں۔ ماں مر رہی ہے اور وہ چین کی نیند سو رہا ہے۔ ایک دفعہ اکیلا آیا تھا تیری بیماری کا سن کر اور بعد میں خبر تک نہ لی۔"

"کیا ہوا۔ آخر بیٹا تو ہے اور پھر انجمن اس کی بہن بھی تو ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ کل صبح کی پہلی بس پر ہی لاہور چلے جاؤ اور اس سے پیسے لے آؤ۔"

"میں.... اس کے پاس جاؤں.... اس بیوی کے بال باندھے کے پاس جاؤں.... اس بال کٹی فیشن ایبل بہو کے پاس جاؤں جس نے برسوں پہلے مجھے اپنے گھر کا نوکر بنا دیا تھا۔ اس نے گھر آئے کی لاج بھی نہ رکھی۔ نہیں شمشاد نہیں، میں اس کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

اچانک حشمت وہاں پہنچ گیا تو اس نے پوچھا "اماں۔ ابو سے کیا راز کی بات ہو رہی تھی؟"

"بیٹا۔ میں تمہارے ابو سے کہہ رہی تھی کہ وہ کل عظمت کے پاس لاہور جائے اور اس سے کچھ پیسے لے آئے تاکہ انجمن کی شادی کر دیں" شمشاد نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا.... اماں کیا واقعی انجمن کی شادی ہونے والی ہے" حشمت نے بغلیں بجاتے ہوئے کہا۔

"ہاں شادی تو ہو جائے گی... کویت سے نور محمد کا بیٹا فضل احمد بھی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ نور محمد نے اپنے بیٹے کے لئے مجھ سے انجمن کا رشتا بھی مانگا ہے۔ لیکن کیا کروں، شادی کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں اور میں عظمت کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں چاہتا" امیر نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"تو ابو آپ مجھے اجازت دیں۔ میں کل لاہور چلا جاتا ہوں اور عظمت سے پیسوں کی گٹھڑی لے کر آؤں گا۔" حشمت نے مسرور کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ تم کل چلے جانا" امیر کے بجائے شمشاد نے مردنی آواز میں کہا۔

دوسرے روز صبح پانچ بجے والی بس میں حشمت بیٹھا اور دن کے بارہ بجے اپنے بھیا کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے کو کھٹکھٹایا۔ کسی نے نہ کھولا تو زور زور سے دستک دینے لگا۔

نیلم اندر سے بڑبڑاتی ہوئی آئی اور دروازہ کھولتے ہی حشمت پر برس پڑی "اندھے ہو گیا.... گھنٹی نظر نہیں آتی۔"

"او جی.... میں.... میں...."

"کیا میں میں لگا رکھی ہے۔ کون ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو؟"

"جی.... کیا یہ عظمت صاحب کا ہی گھر ہے" حشمت نے عاجزی سے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ عظمت کا ہی گھر ہے" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

"جی۔ میں عظمت کا بڑا بھائی ہوں" حشمت نے کہا۔

"اوہو۔ تو آپ عظمت کے بھائی ہیں۔" نیلم نے طنز آمیز لہجے میں پوچھا اور وہاں سے ہی چلائی۔ "اے خیراتن، خیراتن۔"

"جی بیگم جی" خیراتن الٹے پاؤں بھاگ کر وہاں پہنچ گئی۔

"کیا فضلو مرگیا ہے۔ یہ صاحب کب سے دروازہ بجا رہے تھے اور اس نے کھولا نہیں۔ جاؤ ان صاحب کو سرونٹ کوارٹر میں لے جاؤ اور فضلو کے بچے کو میرے پاس بھیجو۔"

"اچھا بیگم جی۔"

"بیگم صاحبہ۔ آپ نے مجھے بلایا ہے" فضلو نے سر جھکا کر پوچھا۔

"فضلو کے بچے۔ تم کہاں مرگئے تھے۔ وہ صاحب جو ابھی تمہارے پاس بھیجے ہیں کب سے دروازہ بجا رہے تھے لیکن تیرے کانوں پر جوں تک نہ رینگی" نیلم نے غصے سے کہا۔

"بیگم صاحبہ۔ اگر وہ گھنٹی بجاتے تو میں فوراً دروازہ کھولتا..... لیکن دروازے کی آواز تو میرے کمرے میں نہیں آتی" فضلو نے جواب دیا۔

"نیلم کو احساس ہو گیا کہ فضلو سچا ہے۔ اگر وہ خود اپنے بال سنوارنے کے لئے بیوٹی پارلر نہ جا رہی ہوتی تو اسے بھی پتا نہ چلتا۔ لیکن چونکہ اس دن عظمت اور اس نے ایک شادی کی دعوت میں جانا تھا۔ اس لئے اس نے سوچا تھا کہ عظمت کے آنے سے پہلے شاہراہ قائداعظم پر واقع حسینہ بیوٹی پارلر سے بال ہی بنوا آئے۔"

چند لمحات چپ رہنے کے بعد وہ پیار بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔ "اچھا فضلو مٹی ڈالو اس بات پر۔ یہ جو مہمان ہے اس کی خاطرداری میں کوئی کسر نہ چھوڑنا' یہ ہمارے سسرالی گاؤں سے آیا ہے۔ سمجھ گئے ناں۔"

"ہاں بیگم صاحبہ۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی شکوہ کا موقع نہیں دوں گا۔" فضلو نے کہا۔

عظمت کے آنے سے پہلے نیلم تیار تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "جانی۔ جلدی سے کپڑے بدلو۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے شگفتہ میرج ہال پہنچنے کا ۹ بجے کا وقت دیا ہے۔ اور اب رات کے دس بج رہے ہیں۔"

"نیلی رانی کوئی بات نہیں۔ میں چٹکی بجانے میں تیار ہوتا ہوں" عظمت نے مسکرا کر کہا۔

اور پھر وہ تیار ہو کر شگفتہ میرج ہال میں چلے گئے۔ اس وقت تک دلہن دولہا کا نکاح پڑھایا جا چکا تھا۔ براتی پر تکلف کھانے کی ڈشوں سے پیٹ پوجا کر رہے تھے۔

رات کے بارہ بجے وہ دونوں واپس آئے تو گھر داخل ہونے سے پہلے نیلم نے چاہت بھرے انداز میں کہا "عظمی۔ تمہارے گاؤں سے حشمت نامی آدمی آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔"

"کدھر ہے میرا بھائی؟" عظمت نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"وہ سرونٹ کوارٹر میں فضلو کے پاس ہے۔"

"میرا بھائی اور سرونٹ کوارٹر میں۔"

"عظمی۔ ہمارے اور ان کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گلی والے اسے دیکھیں اور اس کی بابت پوچھیں گے تو کم از کم میرا سر تو شرم سے جھک جائے گا۔ اس کے تو کپڑوں سے بھی بو آرہی تھی۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا نیلی" عظمت نے قدرے تلخی سے کہا اور سرونٹ کوارٹر کی طرف چل دیا۔ اپنے بھائی کو سینے سے لگا کر ملا اور خوش ہو کر بولا "حشمت بھائی۔ کیسے ہیں ابو' اماں اور نانی اماں..... اور انجمن بہن۔"

"اللہ کا فضل ہے۔"

"کیسے آنا ہوا؟"

"عظمت۔ انجمن کی شادی کرنی ہے۔ ابو نے کہا کہ ایک تو آپ سے رائے لے آؤں ..... اور دوسرا..."

"ہاں بولو بھائی۔ کیا کہا انہوں نے؟"

"ابو نے بولا تھا کہ عظمت سے کچھ پیسے بھی لے آنا تاکہ انجمن کی شادی دھوم دھام سے ہو جائے۔"

"کچھ بتایا تھا کہ کتنے روپوں سے کام بن جائے گا؟"

"ہاں..... ۲۰ ہزار روپے۔"

"اچھا۔ تم اب سو جاؤ۔ میں کل تمہیں ۲۰ ہزار روپے دے دوں گا..... شب بخیر۔"

"شب بخیر عظمی۔"

حشمت رات بھر نہ سو سکا۔ اسے دکھ تھا کہ اس کا بھائی اسے اپنے ساتھ کیوں نہ لے گیا۔ بھابی تو غیر تھی لیکن بھیا تو اپنا خون تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ فضلو نے کہا "حشمت صاحب۔ رات ڈھل چکی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے سو جائیں۔"

"فضلو۔ یہ رات تو میرے لئے بھاری ہو چکی ہے۔ شکر کروں گا جب گزر جائے گی تو" حشمت نے دل گرفتہ ہو کر جواب دیا۔

"اچھا صاحب جی۔ پھر میں تو سوتا ہوں۔"

اور فضلو پل بھر میں خراٹے بھرنے لگا۔ جب کہ حشمت تارے گن گن کر رات گزارنے لگا۔

عظمت واپس آیا تو نیلم نے پوچھا "تمہارا بھائی کس لئے آیا ہے۔ ضرور کوئی کام ہو گا؟"

"ہاں۔ چند روز میں انجمن بہن کی شادی ہے۔ صلاح مشورہ لینے آیا ہے۔"

"تو کہہ دو ان کو' جہاں چاہیں شادی کر دیں۔"

"لیکن ان کو شادی کے انتظام وغیرہ کے لئے ۲۰ ہزار روپوں کی ضرورت بھی تو ہے۔"

"کیا کہا۔ ۲۰ ہزار روپے" نیلم نے ناک بھوں سکیڑ کر کہا۔

"نیلی۔ فی زمانہ ۲۰ ہزار کوئی زیادہ تو نہیں ہیں اور انجمن میری بہن بھی تو ہے۔ میرا بھی کچھ حق بنتا ہے کہ میں رخصتی سے پہلے اسے کچھ دوں۔ اس کے لئے کچھ کروں۔"

"عظمی۔ انہیں ۵ ہزار روپے دے دو۔ اس سے زیادہ اگر دیئے تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"نیلی۔ ناراض نہ ہو۔ جیسا تم کہتی ہو ایسا ہی کروں گا" عظمت نے بھیگی بلی بن کر جواب دیا۔ رات گزری۔ صبح ہوئی۔ عظمت نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا اور ڈیوٹی جانے سے پہلے سرونٹ کوارٹر میں آگیا اور اپنے بھائی حشمت سے علیک سلیک کے بعد بولا "بھیا۔ پیارے بھیا۔ یہ ہیں پانچ ہزار روپے۔ میری طرف سے ابو کو کہنا کہ اس تھوڑی سی مدد کو قبول فرمالیں۔ آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے۔ اگر میرے پاس زیادہ روپے ہوتے تو میں ضرور دیتا لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔"

"لیکن عظمت اس مہنگائی کے دور میں پانچ ہزار سے کیا بنے گا' اس سے تو جمعہ تک نہیں بنے گا۔ جب کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم اپنی پیاری انجمن کی شادی دھوم دھام سے کریں" حشمت نے حیرانی و افسردگی کے امتزاج میں کہا۔

"لیکن میرے بھائی میرے پاس کچھ ہو تو میں آپ لوگوں کے دلوں میں خوشیوں کے دیے جلاؤں" عظمت نے آہ بھر کر کہا اور پھر وہ بات کو ٹالنے کی خاطر فضلو سے بولا۔ فضلو جو بہت خوش تھا اور صاحب کے ارد گرد پتنگے کی طرح چکر لگا رہا تھا اور خوش تھا۔ بہت خوش تھا کہ صاحب پہلی دفعہ اس کے کمرے میں آیا تھا۔

"فضلو۔ بھائی صاحب کو ناشتا وغیرہ کھلا دیا ہے ناں۔"

"ہاں صاحب جی۔ میں نے پراٹھا اور آملیٹ کھلایا ہے اور دودھ پتی کی چائے پلادی ہے" فضلو نے جھک کر جواب دیا۔

"شاباش فضلو۔"

عظمت نے فضلو کو تعریف کا ہار پہنایا اور کہا۔ "فضلو گیٹ کھول دینا۔"

"جی سرکار"

پھر وہ حشمت سے ملا اور کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔

○☆○

عظمت اپنے بھائی و بھابی کے ناروا سلوک پر بہت مضمحل تھا۔ اسے دکھ تھا کہ انہوں نے اسے سرونٹ کوارٹر میں رکھا اور پھولوں سے بھی ملنے نہ دیا۔ بھائی کے جانے کے بعد وہ غموں کو گلے لگائے اٹھا اور فضلو سے التجائیہ لہجے میں بولا "فضلو کیا میرے ساتھ بازار تک چلو گے؟ میں گھر کے لئے کچھ چیزیں خریدنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں سرکار۔ میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

حشمت نے بازار سے نانی اماں ابو اور بہن کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا خریدا اور بس میں بیٹھ کر گھر واپس آگیا۔ اس کے بس کا سفر پورے چھ گھنٹے کا تھا۔ لاہور سے پنڈدادن خان کا سفر۔ وہ پورے سفر میں سوچتا رہا کہ غریبی و امیری کا کوئی جوڑ نہیں۔ اس نے دل میں

مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ عظمت وبھابی کے نازیبا سلوک افشانہ کرکے انہیں غموں کی چادر اوڑھنے سے بچالے گا۔ اسی لئے اس نے ان کے کپڑے بھی خریدے تھے تاکہ ان کو پتا سکے کہ حشمت کا رویہ فراخدلانہ تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو سب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس نے بھی اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے کہا "عظمت بے چارے کے پاس کیس کچھ کم آرہے ہیں۔ ان دنوں اس کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس کے باوجود اس نے کپڑے بھی خرید کردیے ہیں اور پانچ ہزار روپے بھی دیئے ہیں۔" انجمن جھٹ بولی "بھیا۔ میرے کپڑے کون سے ہیں؟"

"یہ ہیں۔ میری بہنیا۔"

"کتنے خوب صورت کپڑے ہیں... کتنے اچھے ہیں میرے عظمت بھیا" انجمن نے مچلتے ہوئے کہا۔

لیکن گھر کے دیگر افراد کی آنکھوں میں چھوٹے چھوٹے قطرے جھلملا رہے تھے۔ وہ تو عظمت سے کچھ زیادہ کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔

اسی رات انجمن تقریباً ۹ بجے سو گئی تو صغرا نے بات چھیڑ دی۔ "انجمن کی شادی کس طرح ہوگی۔ بیٹی شمشاد نے تو صرف سات جوڑے کپڑوں کے بنا رکھے ہیں۔ زیور کا نام ونشان نہیں۔ پھر دین لین اور براتیوں کے کھانے کا خرچہ الگ۔ جس پر ڈھیر سارے روپے خرچ ہوں گے۔"

"اری ماں۔ جو کچھ بچتا تھا، عظمت کی پڑھائی پر خرچ کرتی رہی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ بڑا ہو کر جورو کا غلام بن جائے گا۔ اور ہمیں بال کی طرح مکھن سے نکال دے گا" شمشاد نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"ہاں۔ وہ تو نالائق نکلا۔ لیکن اب مسئلہ عظمت کا نہیں بلکہ انجمن کی شادی کا ہے۔ نور محمد ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی چھٹی ختم ہونے سے پہلے اس کی شادی کردے......"

اور ادھر ہماری شمشاد بیگم بھی اپنی بیٹی کو جلد بیاہنا چاہتی ہیں۔ میرا سر تو چکی کے دو پاٹوں میں پھنس گیا ہے" امیر نے کہا۔

"ابو۔ آپ فکر نہ کریں۔ اس گمبھیر مسئلے کا حل میں نے سوچ لیا ہے" حشمت نے مسرور کن لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟" امیر نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ابو... میں اپنے نانا جی کا گھر جو انہوں نے میرے نام لکھ دیا تھا، بیچ دوں گا۔ اس سے ہمیں اتنی رقم ضرور مل جائے گی کہ جس سے میری گڑیا سی بہن کی شادی شان وشوکت سے ہو جائے گی۔"

امیر کے جواب دینے سے پہلے صغرا نے گرج کے کہا "نہیں حشمت بیٹا۔ تم وہ گھر نہیں بیچو گے۔"

"مگر بڑی اماں کیوں.... کیا وہ گھر انجمن سے قیمتی ہے؟"

"بیٹا۔ انجمن پر میں واری جاؤں۔ لیکن وہ گھر میرے سرتاج کی نشانی ہے۔ میں اپنے جیتے جی اس گھر کو نہیں بیچنے دوں گی۔ ویسے بھی وہ اولاد جو اپنے باپ دادا کی جائداد کو بیچ دیتی ہے، اس کا مقام معاشرے میں گر جاتا ہے۔"

"لیکن بڑی اماں۔ انجمن کو اچھا رشتہ مل رہا ہے۔ فضل احمد جوان ہے اور غیر ملک میں کام کر رہا ہے... ان کے گھر میں چڑیا کے دودھ کے سوا سب کچھ ہے۔ انجمن کی شادی ہو جائے گی تو اس کا ستارہ بخت بھی چمکنے لگے گا اور پھر اس چمک سے ہمارے دلوں میں بھی اجالا بکھر جائے گا۔"

حشمت نے پیار و دلیل سے بڑی اماں کو سمجھاتے ہوئے کہا جب کہ امیر اور شمشاد نے منہ میں گھنگھنیاں ڈالے رکھیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسے جی میں آئے کرو" صغرا نے رک رک کر کہا۔

"پیاری اماں۔ ناراض تو نہیں ہو؟" حشمت نے ٹھوڑی پکڑ کر پوچھا۔

"نہیں بیٹا" صغرا نے حشمت کا دل رکھنے کے لئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ

پھیلادی۔ جب کہ شمشاد خجالت کی چادر اوڑھے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی "میں کتنی ڈائن ہوں کہ میں نے اپنے بھانجے اور بیٹے حشمت کو جائز حقوق سے محروم رکھا۔ اس کی بکی ورسوائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ سوتیلے پن میں سب کچھ بھول گئی۔ حتیٰ کہ اپنے باپ کی خدمت کرکے جنت خرید نہ سکی۔ اگر میں اپاہج باپ کی خدمت گزاری کرتی تو آج میں ہرگز اپاہج نہ ہوتی۔ یہ مکافاتِ عمل ہے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔"

جب اس کی اماں صغرا اور سرکا سائیں! میرا ایک طرف ہوگئے تو اس نے اشارے سے حشمت کو بلایا اور اپنے پاس بٹھایا۔ چند لمحات کے بعد اس نے والہانہ انداز سے حشمت کو چومنا شروع کردیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش برسنے لگی تو حشمت نے گھبرا کر پوچھا "ماں۔ پیاری ماں تم کیوں رو رہی ہو؟"

"بیٹا۔ میں اپنے گناہوں کی چادر کو ان آنسوؤں سے دھونا چاہتی ہوں۔"

"لیکن آپ نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔"

"گناہ..... گناہ نہیں کیا..... یہ تم کہہ رہے ہو۔"

"ہاں ماں۔ ہاں میں کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں میرے بچے۔ یہ تم سچ نہیں کہہ رہے ہو۔"

"ماں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں' تم مانتی کیوں نہیں ہو۔"

"میں کیسے مانوں۔ جب کہ تم مظلوم اور میں ظالم ہوں۔"

"ماں۔ یہ آج تم کیسی باتیں کررہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"اچھا بیٹا۔ اگر تمہیں کچھ خبر نہیں تو پھر ایک احسان اور مجھ پر کرو۔ مجھے معاف کردو تاکہ میں آرام سے مرسکوں" شمشاد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

حشمت نے فوراً ماں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنا شروع کردیا۔ اور شبنمی آنکھوں سے بولا "یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ ماں کی خدمت کرنے سے تو سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور تو الٹا مجھ سے گناہ معاف

کرا رہی ہے..... خدا کے لئے رونا دھونا بند کرو۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں رونا بند کردوں تو پھر مجھے معاف کرنا ہوگا۔ نہیں تو میں مرتے دم تک روتی رہوں گی' روتی رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے ماں۔ میں نے تجھے معاف کیا" حشمت نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ جگ جگ جیو" شمشاد نے حشمت کو سینے سے بھینچ کر کہا۔

O

حشمت نے بڑے ابا کا مکان بیچ دیا اور اپنی بہن کی دھوم دھام سے شادی کردی۔ گھر کے تمام مکین انجمن کی شادی پر شاد و مسرور تھے۔ اگر کوئی انہیں غم تھا تو صرف یہ غم تھا کہ عظمت نے اپنی بہن کی شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔

صغرا کو تو اس کے علاوہ بھی غم تھا۔ وہ غم اسے مکان کے بک جانے کا تھا۔ اس کا دل تو اس روز ہی بجھ گیا تھا جب حشمت نے مکان بیچنے کی تجویز رکھی تھی۔ اس نے اس کی تجویز منظور بھی اس لئے کرلی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ انجمن کے لئے قربانی دینی پڑی۔ کیونکہ انجمن تو پیاری تھی ہی۔ ثانی کیا وہ تو غیروں کے دلوں میں بھی بستی تھی۔

مکان فروخت ہوگیا تو صغرا کے لئے دنیا کا ٹھکانا ختم ہوگیا۔ وہ اللہ والی تھی۔ نماز کوئی قضا نہیں کرتی تھی۔ تہجد مسلسل پڑھتی تھی۔ اس لئے اس کی اللہ نے سن لی تھی۔

"اے رب الارباب۔ میرے شوہر مرحوم کا آشیانہ فروخت ہوگیا۔ تو میرا بھی اس فانی دنیا کا گھونسلا دنیا کی طوفانی ہواؤں کی نذر ہوگیا۔ لیکن میں اس وقت تک زندہ رہنا چاہتی ہوں جب تک میری انجمن' انجمن کی شادی نہیں ہوجاتی۔ اگر میں انجمن کی شادی سے پہلے مرگئی تو پھر اس کی شادی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑجائے گا۔"

اللہ کی بارگاہ میں اس نیک بندی کی دعا مستجاب ہوئی۔ جس رات صغرا کی نواسی انجمن کی ڈولی اٹھی۔ وہ رات مشکل سے گزر پائی کہ شمشاد نے پکارا۔

"اماں۔ پانی... میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔"

لیکن اماں نے کوئی جواب نہ دیا تو شمشاد نے پھر آواز دی۔ "اماں سلام پھیرنے کے بعد

مجھے پانی دینا۔"

جب کافی وقت گزر گیا اور شمشاد کا دم بھی پانی نہ ملنے پر اکھڑنے لگا تو اس نے چیختے ہوئے کہا "کوئی ہے۔پانی... پانی۔"

شمشاد کی چیخ سے امیر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا ملتا شمشاد کے پاس پہنچا اور ذرا تلخ لہجے میں بولا "شمشاد۔ کیوں شور مچا رکھا ہے۔"

"پانی... پانی۔"

امیر فوراً پانی لے آیا اور شمشاد کو پانی پلانے لگا۔

پانی پینے کے بعد شمشاد کا دل کچھ ٹھیک ہوا تو اس نے امیر سے کہا "امیر۔ میں کب سے اماں کو پکار رہی ہوں لیکن وہ تو سننے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ آگے بھی وہ تہجد پڑھتی تھیں لیکن اتنی لمبی کبھی دعا نہیں مانگتی تھیں۔ میں کب سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ مسلسل بیٹھی ہیں نہ تو سجدے میں جاتی ہیں اور نہ ہی اٹھ رہی ہیں۔ ذرا دیکھو تو سہی۔ کہیں وہ انجمن کے جانے کے سبب افسردہ بیٹھی رو تو نہیں رہی ہیں۔"

امیر نے جب صغرا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آواز دی "اماں۔"

تو اماں نے جواب نہ دیا بلکہ فرش کی جانب لڑھک گئی۔ امیر نے نبض پر ہاتھ رکھا تو نبض رک چکی تھی۔ دل کو دیکھا تو دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

اس کے منہ سے دہاڑ نکل گئی۔ اس نے ہمت کر کے صغرا کو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ اس کی آنکھوں کو بند کیا اور پاؤں کے دونوں انگوٹھوں کو باندھ دیا پھر اس نے حشمت کو آکر بتایا

"بیٹا، تمہاری نانی مر گئی ہے۔"

"میری نانی مر گئی ہے۔ نہیں نہیں وہ مر نہیں سکتی۔ وہ کیسے مر سکتی ہے؟"

وہ فوراً نانی اماں کے پاس پہنچا۔ اور اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھنے لگا "ماں۔ تو مر گئی ہے، کیوں مر گئی ہے۔ ابھی تو کل ہی انجمن کی ڈولی اٹھی ہے۔ اور تو بھی جا رہی ہے۔ کیوں کیوں....."

اس کی دہاڑیں سن کر تمام رشتے دار جو انجمن کی شادی پر آئے ہوئے تھے اور صحن میں

سوئے تھے اٹھ پڑے اور دل تھام کر رہ گئے۔

انجمن کا گھر بھی کچھ دور نہ تھا۔ وہ پلک جھپکنے میں وہی عروسی جوڑا پہنے ہوئے بین کرتی ہوئی پہنچ گئی جو نانی اماں نے اسے پہنایا تھا۔ وہ رو رہی تھی "زار و زار رو رہی تھی" نانی اماں۔ تم نے روٹھ کر ہی جانا تھا تو پھر مجھے اپنے ہاتھوں سے سرخ جوڑا کیوں پہنایا۔ مجھے سرمائی جوڑا کیوں نہ پہنایا۔ نانی اماں تم نے تو نصیحت کی تھی کہ میں پیا کے گھر کو اپنا گھر سمجھوں اور خوش رہوں۔ لیکن تم نے تو چند گھنٹوں میں میری خوشیاں چھین لی ہیں۔ کیوں چھینی ہیں۔ جواب دو..... نانی اماں جواب دو۔"

اعزا و اقارب انجمن کی چیخ و پکار سن کر اپنے اپنے دلوں کو مسوس رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھی فرط غم سے آنسو تیر رہے تھے۔

شمشاد بے چاری تو اتنی نڈھال تھی کہ وہ تو رو بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو ہر ایک کو ٹکر ٹکر دیکھتی اور پھر سینہ کوبی کرنے لگی۔ لیکن پھر سینے سے بھی ہاتھ اٹھا لیتی کیونکہ اسے سینے کے ڈھانچے کا درد ماتم بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ بے چاری کے سینے پر ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ گوشت کا تو نام و نشان نہ تھا۔

ایک روز امیر کے گھر سے بیٹی کی ڈولی اٹھی اور دوسرے روز اس کی خوش دامن کا جنازہ اٹھا۔ لوگوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ صرف اڑوس پڑوس اور جانے ملنے والے ہی افسردہ و مغموم نہ تھے۔ بلکہ اس کے آنگن میں لگا پیپل کا درخت بھی جھک گیا تھا۔ اس کے پتے زرد ہو چکے تھے۔ اس کی گائے کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ آکاش بھی آنسو بہا رہا تھا۔ پیپل کے درخت پر بیٹھی، چہکتی مینا بھی بین کر رہی تھی۔

چند دن پہلے جس گھر میں انجمن کی سکھیاں گیت گاتی تھیں اور خوشیوں کے شادیانے بجاتی تھیں، اس گھر میں ماتم ہو رہا تھا اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

چند دنوں کے اندر ماتم زدگان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن امیر نے اپنی ممانی خدیجہ جو کہ لالہ موسیٰ بیاہی ہوئی تھی اسے روک لیا کیونکہ گھر میں روٹی پکانے والا کوئی نہ تھا۔

O✡O

صغرا کو مرے ہوئے ایک ماہ گزرا تھا کہ جمعرات کے روز امیر کی ممانی خدیجہ نے کہا "بیٹا امیر۔ آج دن کی گاڑی پر میں لالہ موسیٰ جاؤں گی اور کل رات کی گاڑی سے گھر کی خبر وغیرہ لے کر آجاؤں گی۔"

امیر کے بجائے حشمت بولا "ٹھیک ہے دادی اماں۔ آپ بے شک جائیں۔ کل جمعہ ہے اور میری چھٹی ہے۔ کھانے وانے کا بندوبست کروں گا۔"

"واہ لعل واہ۔ تم نے میری پریشانی و فکر کا مسئلہ حل کردیا۔ خدیجہ نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ خدیجہ ہر ماہ اپنے گھر جاتی اور اپنے بیٹوں' بہوؤں اور پوتوں کی خبر لے آتی۔ کرتے کرتے ۶ ماہ کا عرصہ بیت گیا۔

پھر ایک خنک سی رات خدیجہ نے نصیحت بھرے انداز میں کہا۔

"امیر بیٹا۔ ماشاءاللہ تیرے دو بیٹے حشمت و عظمت اور ایک بیٹی انجمن ہے 'عظمت اور انجمن تو اپنے اپنے گھروں کے ہو چکے۔ ابھی تمہارا بڑا بیٹا حشمت ہی رہ گیا ہے جس کی تم نے شادی کرنی ہے۔ اب سے ہے اس کی شادی کرنے کا۔ اگلے مہینے میرا بڑا بیٹا اعجاز اپنے اہل وعیال کو لے کر سمنگلی (بلوچستان) جا رہا ہے۔ وہ کاپل سے سارجنٹ بن گیا ہے۔ اسے مکان بھی مل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنے گھر جانا پڑے گا۔ پھر تمہاری 'شمشاد اور حشمت کی روٹی ووٹی کون بنائے گا؟"

"لیکن ممانی جان۔ حشمت کے مکان بیچنے سے جو رقم ملی تھی وہ تو انجمن کی شادی پر لگ گئی۔ ابھی حشمت کی شادی پر پیسہ کہاں سے لگے گا؟" امیر نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹا۔ دل چھوٹا مت کرو۔ پہلی تو بات یہ ہے کہ کسی غریب کے گھر حشمت کی شادی کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ خرچے کے لئے پیسہ میں تجھے دے دوں گی۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر ایک کنال زمین بیچ دو۔"

"لیکن ممانی جان۔ ان دونوں باتوں پر عمل کرنا میرے لئے مشکل ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"زمین بیچنے والے کی معاشرے میں وقعت نہیں رہتی اور آپ سے ادھار لینے کی میری

غیرت گوارا نہیں کرتی۔"

"بیٹا جی۔ جب تم نے حشمت بیٹے کا مکان اونے پونے داموں میں بیچا تو تجھے معاشرے میں اپنی عزت کا خیال نہ آیا۔ اور جب تم نے عظمت کے آگے پیسوں کے لئے ہاتھ پھیلایا تو تیری غیرت نے گوارا کرلیا۔"

"ممانی جان۔ عظمت تو میرا بیٹا ہے۔"

"ہاں میں مانتی ہوں کہ عظمت تیرا بیٹا ہے۔ لیکن عظمت نے تیری خوشیوں کو خاک میں ہی ملایا ہے۔ تجھے غموں کے ہار ہی پہنائے ہیں۔ وہ تو میاں بیوی تم سب کو پینڈو سمجھ کر نوکروں جیسا سلوک کرتے ہیں' تمہیں اس کو بیٹا کہنے سے پہلے ساغر میں پانی ڈال کر ڈوب مرنا چاہئے......"

رہا مجھ سے پیسے لینے کا سوال تو میں تیری ماں ہوں۔ اور بیٹا تو ماں کا عمر بھر مقروض رہتا ہے اور نہ اس کے احسانوں کا بدلہ چکا سکتا ہے۔ پھر تجھے ماں سے کچھ لینے میں خجالت کا احساس کیوں ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ممانی جان۔ زیادہ لیکچر نہ مارو" امیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور ہاں حشمت سے اس کی پسند کے بارے میں ضرور پوچھ لو" خدیجہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ممانی جان۔ وہ تو ابھی پوچھ لیتے ہیں۔"

"حشمت بیٹا" امیر نے پیار سے آواز دی۔

"جی ابا جی۔"

"بیٹا۔ ذرا ادھر آنا۔"

"السلام وعلیکم۔ ابو و دادی اماں۔"

وعلیکم السلام۔ جیتے رہو بیٹا" خدیجہ اور امیر نے یک زبان ہو کر کہا۔

"بیٹا ایک تجھ سے مشورہ لینا" امیر نے خوش ہو کر کہا۔

"کون سا مشورہ' ابو جان۔"

"بیٹا ہم تمہیں شادی کے پنجرے میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم سے معلوم کرلیں کہ تم کس غنچہ ناشگفتہ کی قفس میں گرفتار ہونا چاہتے ہیں۔"

"ابوجان۔ یوں تو ہماری جان پہچان کی لڑکیاں سب ہی اچھی ہیں لیکن چچا فیروز کی بیٹی زاہدہ تو بہت اچھی ہے" حشمت نے شرماتے شرماتے بتایا۔

"تم اس فیروز کی بات کررہے ہو جو تمہارا پڑوسی تھا۔"

"ہاں۔ ابوجی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا.... اب تم جاؤ۔"

دوسرے روز خدیجہ اور امیر دونوں فیروز کے گھر گئے۔ فیروز تو ابھی تک ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا تھا۔ جب کہ زاہدہ اور اس کی سوتیلی ماں شبانہ دونوں موجود تھیں۔

شبانہ نے دونوں کی خوب آؤ بھگت کی اور چائے وغیرہ پلانے کی بعد پوچھا۔ "حشمت کے ابو۔ کیسے آنا ہوا؟"

"جی ہم اپنی پیاری سی بیٹی زاہدہ...." امیر کے بجائے خدیجہ نے ٹھہرتے ٹھہرتے کہا۔ زاہدہ اپنا نام سنتے ہی وہاں سے اٹھ گئی۔ ویسے بھی وہ سمجھ گئی تھی کہ حشمت کا باپ امیر اس کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔

"بہن بولو نا کیا کہنا چاہتی ہو" شبانہ نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"شبانہ بہن۔ آپ تو جانتی ہیں کہ امیر کی بیوی معذور ہے گھر میں کھانا پکانے والی کوئی نہیں۔ پورے ۶ ماہ سے میں کھانا پکارہی ہوں۔ لیکن میں بھی کب تک ان کی مدد کرتی رہوں گی آخر مجھے اپنے گھر جانا ہوگا اور پھر امیر کے لئے مشکل ہوجائے گا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر کے گھر میں ایسی کلی لے جائیں جو اپنی بھینی بھینی خوشبو سے امیر کے گھر کو مہکادے۔"

"میں سمجھ گئی' آپ زاہدہ بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے ہیں" شبانہ نے نچلے ہونٹ کو دباتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی "یہ سمہ ہے زاہدہ کو سزا دینے کا۔ کم بخت ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی ہے۔ ایسی منہ پھٹ ہے کہ سینہ تان کر باپ کو جواب دیتی ہے۔ ابا

میں قصور وار نہیں۔ سارا قصور تو میری ماں کا ہے۔ کم بخت گھر سے دفعان ہوجائے گی تو میرے وارے بھی نیارے ہوجائیں گے.... میں پھر.... جو کچھ اپنے والدین کو چاہوں گی' دے سکوں گی۔ پھر نہ کوئی میری چوری پکڑ سکے گا اور نہ پوچھ سکے گا۔ شیطان کی بچی ہر وقت میرے اوپر نگاہ رکھتی ہے۔ اگر کوئی رشتہ دار مرد ملنے آجائے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہے۔

اگر چوکڑی پر کھڑی ہوکر دیوار کے دوسری طرف عنایت کو آواز دیتی ہوں' جو جوان ہے' خوب صورت بھی ہے لیکن کنوارا ہے اور مجھ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا ہے تو وہ فٹ پوچھتی ہے ماں کون ہے جس سے باتیں کررہی ہو۔ اور میں راز کو راز رکھنے کی خاطر فٹ چوکری سے نیچے اتر آتی ہوں اور جواب دیتی ہوں' عنایت کی ماں سے باتیں کررہی تھی۔ زاہدہ چڑیل کی شادی ہوجائے گی تو پھر میں آزاد ہوجاؤں گی۔ آزاد پنچھی' جس منڈیر پر بیٹھنا چاہوں گی اڑ کر بیٹھ جاؤں گی۔ اپنے عنایت سے جی بھر کر باتیں کروں گی اور دل کی پیاس بھی بجھالیا کروں گی۔

"اری بہن کن سوچوں میں گم ہوگئی ہو" جب کافی دیر تک شبانہ نے جواب نہ دیا تو خدیجہ خاموش نہ رہ سکی۔

"اری بہن۔ آپ نے سوال ہی پیچیدہ ڈالا تھا۔ اس لئے اسے حل کرنے میں وقت لگ گیا۔"

"کیا سوال حل ہوگیا" خدیجہ نے پوچھا۔

"ہاں' میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ زاہدہ کی شادی ضرور ہوگی۔ اور امیر ضرور دولہا بنے گا۔"

"لیکن ہم تو حشمت...." خدیجہ نے جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ شبانہ مسکراتی ہوئی گویا ہوئی۔

"اری بہن۔ امیر کوئی بوڑھا تو نہیں۔ ماشاء اللہ میرے شوہر فیروز سے تو چھوٹا ہے اور خوب صورت بھی ہے' نظر بد دور اگر فیروز دوسری شادی کرسکتا ہے پھر امیر کیوں شادی نہیں کرسکتا۔"

امیر اور خدیجہ دونوں ایک انہونی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ چند لمحات کے سکوت کے بعد خدیجہ نے کہا۔

"امیر۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے تو اس بصیرت افروز پہلو پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ شبانہ بہن ٹھیک کہتی ہے۔ اور میرا بھی خیال ہے کہ تم شادی کر لو۔"

امیر کا دل بھی مچل اٹھا۔ وہ مسرور ہو گیا لیکن ظاہری رکھاؤ کی خاطر بولا "خدیجہ ممانی۔ زاہدہ اور میرا بھی کوئی جوڑ ہے۔ زاہدہ جوان اور میں پکی عمر کا۔"

"ارے امیر کیا فلسفے بکھیر رہے ہو۔ تم تو ماشاءاللہ جوان ہو۔ اگر تم بوڑھے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مرد بھی کبھی بوڑھا ہوتا ہے' مرد تو سدا جوان رہتا ہے" خدیجہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور شبانہ بھی کھل کھل ہنس پڑی "لیکن کیا فیروز مان جائے گا؟" امیر نے پوچھا۔

"مانے گا کیوں نہیں۔ اس کا باپ بھی مانے گا۔ آپ کل پھر آیئے گا۔ میں اس سے پوچھ لوں گی۔ لیکن مٹھائی لینے آنا نہ بھولیئے گا۔ منہ میٹھا کرنے کے لئے۔"

"ٹھیک ہے شبانہ" خدیجہ اور امیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دن ڈھلا۔ شام آئی۔ پھر ملگجی اندھیرے کو گھپ اندھیرے نے اپنی آغوش میں لیا۔ اور زاہدہ نیند کی گود میں لیٹ گئی تو شبانہ نے فیروز سے کہا۔

"آج امیر اور اس کی ممانی خدیجہ ہمارے گھر آئے تھے۔"

"کس لئے آئے تھے؟"

"زاہدہ کا رشتہ لینے کے لئے۔"

"کس کے لئے۔"

"امیر اپنے لئے رشتہ مانگنے آیا تھا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیٹی کچی کلی اور وہ پژمردہ پھول۔ اسے جرات کیسے ہوئی ہمارے گھر آنے کی" فیروز نے طیش میں آکر کہا۔

"[illegible] کہیں زاہدہ جاگ نہ جائے۔"

"اس کے جاگنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے۔ اگر وہ جاگ پڑی تو ہو سکتا ہے کہ ہم فیصلہ نہ کر پائیں۔"

پھر خدیجہ نے طنز کا تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا "کیا شہناز کچی کلی نہیں تھی اور فیروز مرجھایا ہوا پھول۔ تو اس وقت تو نے شہناز کے ساتھ شادی کیوں کی تھی۔ اب اگر امیر زاہدہ کا رشتہ مانگ رہا ہے تو اس میں حرج کیا ہے۔ اس کی مجبوری ہے' اس کی بیوی اپاہج ہے گھر میں کوئی کام کرنے والا نہیں۔ تو پھر اگر وہ بحالت مجبوری شادی کر رہا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ مذہب اسے شادی کی اجازت دیتا ہے۔ اور تمہارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں اگر جوان رشتہ ڈھونڈو گے تو خرچہ ڈھیر سارا خرچ کرنے پڑے گا۔ وہ کہاں سے آئے گا؟ لیکن امیر کے ساتھ رشتہ کرنے سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اسے شادی کی غرض ہے۔ اور ہمیں بیٹی کی ڈولی اٹھانے کے لئے پیسا چاہئے۔ جب ہم دونوں مل جائیں گے تو ہم دونوں کے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ امیر اور زاہدہ کی شادی ہو جائے گی تو ہمارے کندھوں سے بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"تو کیا امیر ہمیں شادی کا خرچہ دے دے گا؟" فیروز نے شبنمی آنکھوں سے پوچھا۔

"دے گا کیوں نہیں۔ وہ تو غرض مند ہے۔ اسے اپنی آرزو کو تعبیر کا لبادہ پہنانے کے لئے ہماری بات ماننی ہی پڑے گی۔ اگر وہ نہ مانے گا تو پھر ہم بھی رشتے سے انکار کر دیں گے۔"

"کیا زاہدہ امیر کے ساتھ شادی پر تیار ہو جائے گی؟" فیروز نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ارے فیروز۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا کبھی ہمارے معاشرے میں کسی نے کبھی لڑکی سے رضامندی لی ہے اور بھولے سے کسی لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔ نہیں' ہرگز نہیں تو پھر ہمیں بھی زاہدہ کی مرضی کے غم کو پلو میں نہیں باندھنا چاہئے۔ کچی عمر کی لڑکیوں کو اپنے بھلے برے کا پتا ہی کیا ہوتا' یہ تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جو قدم بھی اٹھائیں اپنی اولاد کی بہتری کے لئے۔ اور ہم جو زاہدہ کے لئے کر رہے ہیں اس میں اسی کی بھلائی ہے۔"

"ٹھیک ہے شبانہ بیگم" فیروز نے بادل ناخواستہ اپنا فیصلہ سنا دیا۔

دوسرے دن وہ پھر گئے۔ اس روز فیروز ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ان کے جاتے ہی زاہدہ کمرے میں چلی گئی اور اس نے کان دروازے کے ساتھ لگائے۔ اس کا باپ فیروز کہہ رہا تھا۔

"امیر میں تجھے اپنی دامادی میں لینے کے لئے تیار ہوں لیکن شادی میں کچھ وقت لگے گا۔"

زاہدہ نے جب اس کی شادی کا پروپوزل امیر کے ساتھ سنا تو اسے ایسے لگا کہ جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو اور اس کا کلیجہ کچا چبا کھایا ہو۔ وہ دھڑام سے اوندھے منہ چارپائی پر گر پڑی اور زاروزار رونے لگی۔

"آہ بے چاری مشرقی عورت۔ جس کے پاس صرف رونے اور رونے کا ہتھیار ہوتا ہے۔ بے چاری اپنے حقوق کی حفاظت بھی نہیں کر سکتی۔ حیات مستعار میں کتنی بار جلتی ہے اور مرتی ہے۔ الاقارب کالعقارب۔ اپنے پیارے ہی موت کی وادی میں دھکیل دیتے ہیں۔"

"وقت کیوں لگے گا؟" امیر نے پوچھا۔

"اس وقت میرا ہاتھ تنگ ہے' میں زاہدہ کی شادی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"ارے میرے بھولے سرتاج۔ جب تم زاہدہ کا ہاتھ امیر کے ہاتھ میں تھمانے کے لئے تیار ہو۔ تو پھر امیر تیرا اپنا بن گیا۔ امیر تجھے شادی کا خرچہ دے گا۔ امیر کے پاس رقم کی کون سی کمی ہے۔ ایک کنال زمین بیچے گا تو دونوں اطراف کا خرچہ پورا ہو جائے گا۔"

"ہاں فیروز' تم پیسے دھیلے کی فکر نہ کرو۔ بس شادی کی تیاری کرو۔ تمہیں ایک دو روز میں پیسا مل جائے گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

"فیروز بھائی۔ شادی کی تاریخ تو دے دیں" خدیجہ نے ہنس کر پوچھا۔

"بہن۔ جب امیر شادی کا خرچہ وغیرہ دے دے گا۔ اس کے پندرہ دن بعد شادی کی تاریخ مقرر کر لیں گے۔"

"منظور" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور امیر نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

پھر وہ خوشی خوشی گھر واپس آ گئے۔ حشمت نے ان کو خوش خوش گھر آتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ فیروز چچا نے شادی کی بات پکی کر دی ہے لیکن دوسرے روز اس کے ابو نے بذات خود اسے شادی کی خبر نہ سنائی تو اس نے سہمتے ہوئے پوچھا "ابو۔ چچا فیروز نے کیا جواب دیا؟"

"فیروز تمہیں اپنی دامادی میں نہیں لینا چاہتا۔"

"وہ کیوں؟" حشمت نے دل گرفتہ ہو کر پوچھا۔

"وہ چاہتا ہے کہ میں..... میں۔۔ زاہدہ سے شادی کر لوں" امیر نے رک رک کر جواب دیا۔

"ابو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زاہدہ اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"کیا کہا۔ تم زاہدہ اور میری شادی میں دیوار بن کر حائل ہو جاؤ گے۔ کیا تجھے کسی کی بہن سے محبت کرنے میں شرم نہیں آئی۔ اگر کوئی تیری بہن سے محبت کرے تو کیا تم برداشت کر لو گے۔ ہرگز نہیں۔ دوسروں کی بہنوں کو بھی اپنی بہن کی طرح سمجھو۔ مزید برآں اب زاہدہ تیری ماں بننے والی ہے۔ اب زاہدہ کا نام احترام سے لینا۔ سمجھ گئے نا۔ ہم دونوں کی منگنی بھی ہو گئی ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ زاہدہ میری ہے اور میری رہے گی" حشمت نے سسکیاں بھرتے بھرتے کہا۔

امیر نے تڑاخ سے تھپڑ حشمت کے منہ پر مارا اور دھاڑتے ہوئے بولا "بے شرم۔ ماں سے شادی کرو گے۔ نالائق دفع ہو جاؤ میرے گھر سے..... میں تجھے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے عاق کرتا ہوں۔"

حشمت نے اپنے سرخ گال پر ہاتھ رکھا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے ڈگ بھرتا باہر آ گیا۔ سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ رات کی گاڑی میں بیٹھ کر ملک وال اسٹیشن پہنچا اور ملکوال اسٹیشن سے صبح ۲ بجے چلنے والی گاڑی چناب ایکسپریس میں بیٹھ کر کراچی پہنچ گیا۔

شمشاد جو باپ بیٹے کی زہریلی گفتگو سن رہی تھی اور جس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے لاکھ آوازیں حشمت کو دیں "بیٹا رک جاؤ۔ بیٹا مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ" مجھ غریب پر ترس کھاؤ۔"

لیکن حشمت کان دبا کر چلا گیا۔ ایک دکھی عورت کو ظالم سماج کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے چھوڑ گیا۔

ماہ بھری گزرا ہو گا کہ امیر زاہدہ کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ سہاگ رات زاہدہ کے جذبوں اور امنگوں کو مرغ بسمل کی طرح ذبح کر دیا گیا' اس گھر میں جو اس کے اپنے محبوب کا گھر تھا۔ آہ بدنصیب زاہدہ اپنے محبوب کے گھر' اپنے محبوب کے باپ کے ہاتھوں پس گئی۔

لیکن اس گھر میں وہ اکیلی صنف نازک نہ تھی جس نے مرد کے ہاتھوں زخم کھائے تھے بلکہ ایک دوسری عورت بھی تھی اور وہ عورت شمشاد بیگم تھی۔

شمشاد بیگم کا کبھی طوطی بولتا تھا۔ امیر تو اس کا غلام تھا۔ وہ ہر بات بلا چوں چرا اس کی مانتا تھا۔ لیکن اس رات اولاد کے ہوتے ہوئے وہ زخمی پرندے کی مانند تڑپ رہی تھی اور پانی پانی مانگ رہی تھی۔

جب کہ دوسرے کمرے میں وہ امیر جو اس پر جان چھڑکتا تھا سہاگ رات منا رہا تھا۔

آخر شمشاد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جو ماہی بے آب کے ساتھ ہوتا ہے وہ مسہری پر تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئی۔

صبح سویرے امیر خوشی خوشی شمشاد کے کمرے میں آیا اور مسرت بھرے لہجے میں بولا "شمشاد بیگم۔ امروز مابدولت بہت شاد ہیں۔ آج ہماری رات بہت سکون سے گزری ہے اور اب تمہارے لیل و نہار بھی سکون سے گزریں گے۔ زاہدہ باندیوں کی طرح تیری خدمت کرے گی لیکن صرف دن کو..... رات کو وہ میری ہو گی..... میری ہو گی۔"

امیر نے جب اترا کر شمشاد بیگم کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ شمشاد دائمی نیند سو رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں قلوپطرہ جیسی چمک دمک بھری تھی جب کہ ہونٹوں پر مونالیزا جیسی مسکراہٹ تھی۔

اس نے گھبرا کر آواز دی "زاہدہ۔ شمشاد مر گئی۔ شمشاد مر گئی ہے۔" اور زاہدہ جس کی روح تو مر چکی تھی لیکن جسم میں تھوڑی سی رمق باقی تھی۔ وہ بھاگتی وہاں پہنچی اور شمشاد کے پاس بیٹھ کر اپنی اور اس کی بدبختی پر ماتم کرنے لگی۔ اس نے اتنا ماتم کیا کہ ہر دیکھنے والے کی آنکھ اشکبار و متحیر تھی کہ ایک سوکن معذور سوت کے لئے ڈھیر سارے آنسو بہا رہی تھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اس بدبخت کے دل کے اندر انگارے دہک رہے تھے۔

"اور جب دل میں انگارے ہی انگارے دہک رہے ہوں تو اس کی تپش سے دل رونے لگتا ہے اور آنکھوں سے بھادوں بھرن برسنے لگتی ہے۔"

ماں باپ تو بھادوں بھرن ہوتے ہیں۔ خوشیوں کی بھرن۔ جس سے دکھ دھل جاتے ہیں اور جسم اجلا اجلا ہو جاتا ہے۔"

حیف صد حیف زاہدہ کے من میں تو اس کے والدین نے الاؤ بھڑکا دیا تھا۔ جس کی تپش سے اس کا پورا بدن جل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ سینے پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

۲ ماہ قبل امیر کے گھر سے ڈولی اٹھی تھی۔ انجمن کی۔۔۔ اپنی بیٹی کی۔ اور صبح ہوتے ہی اس کی خوش دامن کی میت اٹھی۔

پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ایک رات امیر کے گھر میں زاہدہ کی پالکی آئی اور صبح اس کی شمشاد کا جنازہ اٹھا۔ جس کی موت پر سب گلی محلے والوں کے دل رو رہے تھے۔ کچھ ذاکنیں میں تبصرہ کر رہے تھے۔

"اچھا ہوا بے چاری مر گئی۔ اس کے دامن میں تو دکھوں کے کانٹے ہی کانٹے بھرے تھے۔ جن کی چبھن سے وہ کراہتی ہی رہتی تھی۔ ابھی مرنے سے اس کے دکھ تو دور ہو گئے ہیں۔ اب بے چاری قبر میں آرام سے تو سو سکے گی۔"

○✡○

کراچی میں حشمت اپنے بچپن کے دوست عبدالرحیم کے پاس رہنے لگا۔ عبدالرحیم دسویں تک حشمت کے ساتھ پڑھتا تھا۔ دسویں پاس کرنے کے بعد وہ کراچی آ گیا اور پولیس

میں بھرتی ہو گیا تھا۔ سال کے بعد اس کی پھوپی کی بیٹی کے ساتھ شادی ہو گئی اور وہ اپنی بیوی فاطمہ کو کراچی لے آیا اور گورا قبرستان کے قریب پولیس کوارٹرز میں کوارٹر نمبر 8 میں رہنے لگا۔

عبدالرحیم اور اس کی بیوی نے حشمت کی دکھ بھری بپتا سنی تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

توبہ توبہ۔ یہ زمانہ بھی آنا تھا کہ ایک باپ نے بیٹے کی دل پسند لڑکی سے شادی کر لی۔ اس لڑکی سے جس پر اس کے بیٹے کی محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ توبہ توبہ۔

چند دنوں کی تگ و دو اور عبدالرحیم کی کوشش سے حشمت کو بختیار پلاسٹک کمپنی میں نوکری مل گئی۔ معقول تنخواہ پر۔

حشمت اپنے دوست پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے نوکری کر لی اور اپنی کمپنی کے ایک چھڑے دوست ماجد کے ساتھ ڈی بلاک میں ڈیلائٹ سینما کے پاس رہنے لگا۔

عبدالرحیم چاہتا نہیں تھا کہ حشمت اس سے دور رہے لیکن اس نے بادل ناخواستہ اسے الگ رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس لئے کہ اس کی کمپنی اس کے رہائشی مکان واقع شیر شاہ سے بہت نزدیک تھی اور وہ پیدل جا سکتا تھا۔ اور اگر حشمت اس کے پاس گورا قبرستان میں رہتا تو اسے بہت سویرے اٹھنا پڑتا۔ بس یا پک اپ پر سفر کرنا پڑتا۔ دھکے الگ کھانے پڑتے اور کچومر الگ بنتا۔

حشمت کو اچھی نوکری بھی مل گئی تھی اور تنخواہ بھی معقول تھی لیکن پھر بھی وہ کراچی رہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زاہدہ سے بہت دور۔ بہت دور جانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کی طرف سے آنے والی باد سموم اس کے جسم کو مزید جھلسا نہ سکے۔ وہ پاکستان چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

اپنی خواہش کو تعبیر کا لبادہ پہنانے کے لئے اس نے اپنے بہنوئی کو خط لکھا اور اپنے تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے لئے کویت کا ویزا نکلوائے

جواب میں اس کے بہنوئی فضل احمد نے اسے خط لکھا۔

"بھائی حشمت۔ آج کل کویت میں کام آسانی سے نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی میں تمہارے

لئے آزاد ویزے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد کہیں اچھا کام مل گیا تو پھر اس کام پر تجھے لگوا دوں گا۔ ابھی تم جلدی سے پاسپورٹ بنواؤ اور اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دو تاکہ میں تمہارے لئے ویزا نکلوا سکوں۔"

بھائی فضل احمد کے خط کو پا کر اور پڑھ کر حشمت کے چہرے پر دھنک اتر آئی۔ وہ خوش خوش اپنے دوست عبدالرحیم کے پاس گیا۔

شیر شاہ سے سیدھی بس تو جاتی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ پہلے بس میں بیٹھ کر ملی مارکیٹ آیا۔ وہاں سے پیدل چل کر ڈینسو ہال پہنچا۔ ڈینسو ہال سے چند قدم دور لیاقت روڈ پر آ کر صدر کی بس میں بیٹھ کر صدر آ گیا۔

بوہری بازار سے بھابی فاطمہ کے لئے ریشمی سوٹ خریدا اور صدر سے شاہ فیصل کالونی جانے والی بس میں بیٹھ کر گورا قبرستان اسٹاپ پر اترا اور عبدالرحیم دوست کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔

بھابی فاطمہ نے دروازہ کھولا۔ وہ حشمت کو سفید قمیض اور نیلی جیکٹ میں دیکھ کر نخوت و مسرت سے بولی "چشم بددور۔ صدقے جاؤں اپنے بھائی پر۔ آج تو ایسے لگ رہا ہے جیسے پریوں کے دیس کا شہزادہ آیا ہے۔"

فاطمہ چہکتی ہوئی اندر آئی اور خوشی سے سرشار ہو کر بولی "دیکھو جی۔ کون آیا ہے؟"

عبدالرحیم نے اپنے دوست کو خوب صورت کپڑے پہنے شہزادے کے روپ میں دیکھا تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے فرط مسرت سے حشمت کو گلے لگا لیا اور بھینچ کر بولا "یار۔ آج تو نے میرے من میں خوشیوں کا جوت جگا دیا ہے۔"

پھر عبدالرحیم چہکتے ہوئے بولا "بانو رانی۔"

"جی سرتاج؟"

"بانو۔ جلدی جلدی میز پر کھانا لگاؤ۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سرتاج۔"

آناً فاناً کھانا میز پر لگ گیا اور تینوں افراد نے مل کر کھایا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور

چلا۔

حشمت نے چائے کی چسکی لینے کے بعد کہا "یار رحیمو۔ تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کس کام کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں؟"

عبدالرحیم مسرور ہو کر بولا "حشو۔ تم نے مجھے رحیمو بول کر بچپن کی یاد تازہ کر دی ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں' اس وقت اللہ دین کا چراغ بھی میرے پاس ہے' مانگو جو کچھ مانگنا ہے۔ مانگو۔"

"یار۔ مجھے پاسپورٹ بنوا دو۔"

"تم پاسپورٹ کیوں بنوانا چاہتے ہو؟"

"میں کویت جانا چاہتا ہوں۔ بہنوئی فضل احمد کے پاس۔"

"آہا۔ میرا بھائی امیر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"تو پھر کل ہی پاسپورٹ آفس جائیں گے اور چند دنوں میں تجھے پاسپورٹ بنوا دیں گے۔"

"شکریہ۔ یار شکریہ۔"

رات حشمت اپنے دوست کے گھر ہی سویا کیونکہ دوسرے دن اس کی شام کی شفٹ تھی۔ وہ صبح ۹ بجے پاسپورٹ آفس گئے۔ ضرور کاغذات پر کئے اور متعلقہ دفتر میں جمع کرا دئے۔

عبدالرحیم پولیس کا آدمی تھا۔ اور اس کی پاسپورٹ آفس میں کافی شناسائی تھی۔ اس لئے اسے پاسپورٹ لینے کی تاریخ ایک ہفتے بعد کی مل گئی۔ عبدالرحیم نے حشمت کو اس آدمی سے بھی ملوا دیا تھا کہ جس کی وساطت سے اس نے دفتر سے پاسپورٹ لینا تھا۔

ہفتہ گزرنے کے بعد وہ پاسپورٹ لینے کے لئے دفتر آیا۔ مطلوبہ آدمی کو ملا اور اسے پاسپورٹ کی رسید دی۔ اس نے اسے چائے اسٹال پر بٹھایا اور چائے کا آرڈر دیا۔

تو حشمت بولا "سر۔ آج چائے میری طرف سے ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔"

بھلا اسے اعتراض بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ تو صبح کا ناشتا اور دن کا کھانا مفت میں ہی کھاتا تھا۔

چائے پینے کے بعد وہ دفتر میں گیا اور منہ لٹکائے واپس آگیا۔

حشمت اسے خالی ہاتھ دیکھ کر افسردہ ہو گیا۔ اس نے افسردگی سے پوچھا "سر۔ آپ پاسپورٹ نہیں لائے؟"

وہ دانتوں سے ناخن کریدتے ہوئے بولا "کبیر صاحب کہہ رہے ہیں۔ حشمت عبدالرحیم کا آدمی ہے۔ اس لئے دو سو روپے سے کام چل جائے گا۔ ورنہ میں تو اپنے گاہک سے پورے پانچ سو روپے لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر۔ یہ لیں دو سو روپے" حشمت نے دو سرخ سرخ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ پھر وہ گیا۔ سو روپے اس نے اپنی جیب میں رکھے۔ سو روپے کبیر صاحب کو دیے اور پاسپورٹ لا کر حشمت کو دے دیا۔ حشمت پاسپورٹ لے کر خوشی خوشی گھر واپس آگیا۔

○☆○

پاسپورٹ کی فوٹو کاپی بھیجنے کے ایک ماہ بعد حشمت کو رجسٹر خط ملا۔ جس میں اسے خوش خبری دی گئی تھی کہ اس کا ویزا بن گیا ہے اور اس نے پی ٹی اے ایڈوانس بھیج دی ہے۔ پی آئی اے والے اسے اپنے آپ انفارم کر دیں گے۔ نوید مسرت پا کر اس کے دل کا کنول کھل اٹھا۔ وہ یہ خوش خبری خود جا کر عبدالرحیم اور بھابی کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن مجبور تھا کیونکہ اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ فون سے بھی مطلع نہ کر سکتا تھا کیونکہ اس کے دوست کے گھر میں فون نہیں تھا۔ ان کی چوکی گھر سے دور تھی ورنہ وہاں فون کرتا اور کوئی آدمی اسے گھر اطلاع دے دیتا۔

وہ عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ وہ اپنی خوشی میں اپنے پیارے دوست کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے پولیس چوکی فون کر دیا۔

"ہیلو۔"

"یس۔ پولیس اسٹیشن۔"

"جی۔ عبدالرحیم صاحب کو پیغام دینا ہے۔"

"ذرا ٹھہریں۔ ابھی بات کرا دیتا ہوں۔"

حشمت حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ ضرور پولیس مین نے پی ہوگی۔ ورنہ عبدالرحیم کی ڈیوٹی تو ہمیشہ صبح کی ہوتی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو۔ عبدالرحیم اسپیکنگ۔"

"رحیمو۔ کیسے ہو؟"

"او۔ میرے یار حشو۔ تمہیں کیسے الہام ہوگیا ہے کہ میری رات کی ڈیوٹی ہے کہ فٹ فون کر ڈالا۔"

"رحیمو دوست۔ الہام تو نہیں ہوا۔ خوشی ایسی ملی تھی کہ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ سوچا کہ پیغام دے دوں۔ شاید کوئی اچھا آدمی ڈیوٹی پر ہو جو میرا پیغام تم تک پہنچا دے۔ لیکن جب خدا رحم پر آتا ہے تو چھت پھاڑ کر دے دیتا ہے۔ کہ آج رات کو تم خود ہی فون پر مل گئے۔ بتاؤ رات کو پولیس اسٹیشن کیسے آ گئے ہو؟" حشمت نے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔

"ایک پولیس مین کا بھائی فوت ہوگیا تھا۔ وہ چھٹی پر چلا گیا۔ ایمرجنسی چھٹی پر۔ تو صرف دو گھنٹوں کے لئے مجھے ڈیوٹی پر بلا لیا گیا۔ ابھی پہنچا ہی تھا کہ تمہارا فون آ گیا۔ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ فون کیوں کیا ہے؟"

"ارے رحیمو دوست۔ میرا.... میرا ویزا بن گیا ہے۔"

"حشو۔ بہت بہت مبارک ہو۔ لیکن کیا تمہارے پاس ویزے کی کاپی پہنچ گئی ہے۔"

ویزے کی اصل نقل تو فضل بھائی نے نہیں بھیجی ہے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر کہ کہیں گم نہ ہو جائے لیکن اس نے فوٹو کاپی بھیج دی ہے اور پی ٹی اے ایڈوانس بھی بھیجی ہے۔ پی آئی اے والے ٹکٹ ایشو کردیں گے۔ اور ویزے کی اصل کاپی مجھے ائرپورٹ کویت پر مل جائے گی۔"

"پھر کب تک جانے کا ارادہ ہے؟"

"جب پی آئی اے والے انفارمیشن دیں گے۔"

"انفارمیشن وغیرہ کو چھوڑو۔ آج گھر آجانا۔ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد۔ دس بجے صبح تک تو تم پہنچ ہی جاؤ گے۔ پھر تھوڑا سا چائے کا دور چلائیں گے اور بعد میں پی آئی اے کے ہیڈ آفس میں جائیں گے اور ٹکٹ وغیرہ ایشو کرائیں گے۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ جب تمہیں بذریعہ ڈاک اطلاع مل گئی ہے تو پھر پاکستان انٹرنیشنل ائرلائن ہیڈ آفس بذریعہ ٹیلکس تم سے پہلے اطلاع مل گئی ہوگی۔ ممکن ہے تم نے اپنا فون نمبر غلط دیا ہو یا فون دیا نہ ہو اور انہوں نے تجھے سادہ خط سے اطلاع دے بھی دی ہو؟"

"رحیمو یار۔ فضل بھائی کو تو فون نمبر میں نے دیا ہی نہیں تھا.... آپ کی بات صحیح ہے' میں ڈیوٹی ختم ہونے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ۹ بجے تک پہنچ جاؤں گا اور ناشتا تمہارے پاس کروں گا۔"

"او کے۔ حشو یار۔"

عبدالرحیم ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے اسی دن اسے ٹکٹ وغیرہ بھی ایشیو کرا دیا۔ فارن کرنسی میں دو سو ڈالر بھی بینک سے لے دیئے اور پلاسٹک انڈسٹری سے تمام حساب بے باق کرا دیا اور بذریعہ فون فضل احمد کو حشو کے پہنچنے کی اطلاع بھی دے دی۔

حشو کو عبدالرحیم اور اس کی بیوی فاطمہ ائرپورٹ چھوڑنے آئے۔ حشمت علی ٹرمینل نمبر ۳ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے محسن و جگری دوست رحیمو کو گلے لگ کر ملا۔ اپنی بھابی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شبنمی آنکھوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ آخر اسے اپنے دوست سے بچھڑنے کا غم تو تھا ہی۔

عبدالرحیم اور اس کی بیوی اپنے حشو بھائی کو خدا حافظ کہنے کے بعد واپس آ گئے۔

حشمت کے پاس سامان تو تھا نہیں صرف ہینڈ بیگ تھا۔ وہ بغیر سامان والے کاؤنٹر پر گیا اور بورڈنگ کارڈ لے کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چل دیا۔ امیگریشن آفیسر نے اس کا پاسپورٹ دیکھا تو منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔ "بھئی۔ پاسپورٹ میں تمہارا ویزا تو نہیں لگا ہے۔"

"صاحب۔ وہ کویت ائرپورٹ پر ملے گا۔ یہ دیکھیں ویزے کی فوٹو کاپی۔"

"ویزے کی فوٹو کاپی وغیرہ نہیں چلے گی" اس نے ذرا طیش میں کہا اور اپنے ساتھی کو بلایا اور اسے آنکھ کے اشارے سے سمجھاتے ہوئے پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

وہ اسے ایک اور کمرے میں لے گیا اور ہنستے ہوئے بولا "حشمت صاحب۔ پاسپورٹ پر تمہارا ویزا تو لگا نہیں ہے۔ لیکن اتنا تو بتاؤ کہ تمہارے پاس فارن کرنسی وغیرہ ہے کہ نہیں؟"

"سر۔ دو سو امریکن ڈالر ہیں۔"

"تو پھر تمہارا کام بن گیا۔ دو سو امریکن ڈالر میں ٹکٹ ٹکاؤ کرا لو اور کویت چلے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

پھر وہ اسے باہر لایا اور حشمت کا پاسپورٹ اسی آفیسر کو دے دیا جنہوں نے اسے چیک کیا تھا۔ اس نے اس کے پاسپورٹ پر مہر لگائی اور اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

حشمت ڈیپارچر لاؤنج میں آیا تو خوب صورت تزئین و آرائش اور خوب صورت کرسیوں کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر ہی بیٹھا ہو گا کہ مائیک پر اعلان ہوا۔ "کویت جانے والے مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ گیٹ نمبر ون سے چیک آؤٹ کرائیں۔" حشمت بھی لائن میں لگ گیا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ باہر نکلا۔ تو بس میں بیٹھ کر خوش ہو گیا۔ وہ خوب صورت بس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

جہاز کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو ائر ہوسٹس نے ویلکم کہا تو اس کا دل اور کھل گیا۔ جہاز کے اندر پہنچا تو دوسری ہوسٹس نے علیک سلیک کے بعد اسے اپنی سیٹ پر بٹھایا تو وہ اس کے حسن سلوک سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ چونکہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ لہٰذا باہر کا نظارہ کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر جہاز نے ٹیک آف کیا تو جہاز کی طرح اس کا دل بھی بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ اپنے پہلے ہوائی سفر سے بہت خوش تھا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے کہ وہ پریوں کے دیس میں آ گیا ہو۔ کیونکہ ہر لمحے اپسرائیں ہی اس کے سامنے آ رہی تھیں۔

کسی نے جہاز میں ویلکم کیا۔ کسی نے بورڈنگ کارڈ دیکھ کر سیٹ پر بٹھایا۔ کوئی جہاز کے اڑانے کے تھوڑی دیر کے بعد ایک مشروب دے گئی اور دوسری اپسرا اخبار۔

پھر گرم گرم کھانا آ گیا۔ گرم گرم پلاؤ۔ شامی کباب' سویٹ ڈش وغیرہ۔ کھانے کے بعد چائے بھی آ گئی۔

حشمت پر تکلف خاطر تواضع سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ضرور کوئی سنہرا سپنا دیکھ رہا ہے۔ یا کسی دوسرے جہان میں آ گیا ہے۔"

وہ سپنوں کا جھولا جھلاتا کویت ائرپورٹ پر پہنچ گیا۔ وہ خوب صورت ائرپورٹ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ پاسپورٹ چیک کرانے کے لئے دوسرے مسافروں کے ساتھ لائن میں لگ گیا۔ اس کی باری آئی۔ اس نے اپنے کاغذات دکھائے اور کارروائی مکمل کرا کر باہر آ گیا۔

وہ خوش تھا کہ کویت کے امیگریشن آفیسر نے اس سے ویزے کے بابت کوئی سوال نہ کیا۔ اس کا سفر بہت سہانا گزرا تھا۔ وہ پی آئی اے کے عملے کے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اگر اسے تھوڑا سا رنج تھا تو وہ صرف آغاز سفر کے وقت۔ جب ایک آفیسر نے اس سے دو سو ڈالر لیے تھے۔

پھر وہ خوشی خوشی باہر نکلا تو ارائیول لاؤنج کے باہر فضل احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں بھائی گلے ملے اور فضل اسے ٹیکسی میں بیٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس نے اس کے لئے کمرے میں پہلے ہی ایک لوہے کا پلنگ بچھا دیا تھا۔

حشمت اپنے بہنوئی فضل کو خوشیوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگا کر اپنے سفر کا حال بتا رہا تھا۔ لیکن فضل کچھ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ آخر حشمت سے رہا نہ گیا اور وہ افسردہ لہجے میں بولا "بھائی فضل' کیا بات ہے۔ آپ مجھے ائرپورٹ پر تو بہت کھل کر ملے تھے۔ لیکن ایک قلیل سے وقت میں تم پر کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ کہ تم میری باتوں میں کچھ دلچسپی نہیں لے رہے ہو۔"

"ہاں بھائی۔ تم نے سچ ہی کہا ہے' مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے" فضل نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"بھائی فضل۔ کیا قہر ٹوٹ پڑا ہے۔ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ" حشمت نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"آج ہی مجھے انجمن کا تار ملا ہے۔"

انجمن کا نام سن کر حشمت بھی افسردہ ہو گیا۔ وہ دل کو پکڑ کر بولا "ہاں بھائی فضل۔ بتاؤ ناں۔ انجمن نے کیا لکھا ہے۔ پلیز بتاؤ بھی۔"

"انجمن نے لکھا ہے۔ کہ خدیجہ کے سب سے چھوٹے بیٹے ارشد کی شادی تھی۔ چچا امیر اور چچی زاہدہ پنڈدادن خان سے بس میں بیٹھ کر شادی میں شرکت کرنے لالہ موسیٰ جا رہے تھے۔ جونہی بس رسول ڈیم کی حد میں داخل ہوئی تو بس ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی اور رسول ڈیم کے پل کے جنگلے کو توڑتی ہوئی دریائے جہلم میں گر گئی اور سب مسافر لقمہ اجل بن گئے۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون" حشمت نے پڑھا۔

حشمت کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کچھ لمحات کے بعد اس کے منہ سے آہ نکلی۔

"آہ۔ بدنصیب زاہدہ۔"

اور پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دل ہی دل میں زاہدہ کی قسمت اور باپ کی عشرت پر ماتم کرتا رہا۔ اور نہ جانے کب تک دل ہی دل میں دل کے آبلے پھوڑتا رہا اور پھر سو گیا۔

OOO

حسب معمول فضل احمد نور کے تڑکے اٹھا۔ نہایا دھویا' نماز پڑھی۔ انڈے اور ڈبل روٹی کا ناشتا کیا۔ بوائلر سوٹ پہنا۔ سیفٹی شوز پہنے اور کام کو چل دیا۔ وہ پاور ہاؤس میں کام کرتا تھا۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔

حشمت نے چاپوں کی آواز سنی تو جاگ پڑا اور فضل بھائی کو کام پر جاتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "فضل بھائی۔ کام پر جا رہے ہو کیا؟"

"ہاں حشمت بھائی۔"

"کیا مجھے نہیں لے چلو گے؟"

"تم کچھ دن آرام کر لو۔"

"لیکن میں آرام کرنے نہیں بلکہ کام کرنے آیا ہوں۔"

"حشمت جب تمہیں کام ملے گا تو کام کرو گے نا" فضل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھیا۔"

"اور ہاں۔ میں نے تمہارے لیے آملیٹ اور ڈبل روٹی تیار کر دی ہے۔ چائے بھی بنا کر تھرموس میں ڈال دی ہے۔ نماز پڑھ کر ناشتا کر لینا" فضل نے جاتے جاتے کہا۔

دوسرے روز حشمت نے پھر کام پر جانے کی ضد کی تو فضل پیار سے بولا "حشمت بھائی۔ تمہارا آزاد ویزا ہے۔ میں تمہارے کام کے لئے سر توڑ کوشش کر رہا ہوں۔ جونہی مناسب جاب مل گیا تو پھر تمہیں کام پر لگا دوں گا۔"

"کیا یہاں دہاڑی پر کام نہیں ملتا؟"

"ملتا ہے لیکن قسمت سے ... یہاں سے چند قدموں پر ایک معروف سوق فالح جس کے چوراہے پر دہاڑی پر کام کرنے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی ٹھیکے دار آتا ہے اور مطلوبہ مزدوروں کو لے جاتا ہے۔ ٹھیکیداروں کے علاوہ گھروں میں کام کرانے والے بھی آتے ہیں۔ الغرض یہ وہ جگہ افرادی قوت کی منڈی ہے۔ جہاں قسم قسم کے کام کرنے والے مزدور اکٹھا ہوتے ہیں۔"

"تو پھر مجھے بھی اس سوق میں چھوڑ جاؤ۔" حشمت نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"اوکے حشمت۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

پھر فضل مجبوراً حشمت کو سوق فالح چھوڑ گیا۔ جہاں دوسرے مزدوروں کا میلہ لگا تھا۔ حشمت نے تھوڑی دیر میں یہ بات نوٹ کر لی کہ جونہی کسی شیخ کی کار آتی تو مزدوروں کا ریلا اس طرف بھاگتا اور شیخ دو تین مزدور کار میں بٹھا کر لے جاتا۔

حشمت سب کچھ صبح نو بجے تک دیکھتا رہا۔ پھر دوسروں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی کاروں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔

آخر ایک شیخ کار سے نکلا۔ اور اس نے شائستگی سے کہا۔ "مجھے گھر کے کام کے لئے ایک آدمی چاہئے۔ پورے چار دینار دوں گا۔"

گھر کا نام سن کر سب مزدور رفوچکر ہو گئے۔ صرف حشمت رہ گیا۔

عربی شیخ نے اس سے پوچھا "تمہیں کام منظور ہے؟"

حشمت عربی تو جانتا نہیں تھا۔ وہ اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اس لئے اس نے دوسرے پاکستانی سے پوچھا۔ "شیخ صاحب کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ گھر کے کام کے لئے ایک آدمی چاہئے۔ وہ چار دینار یومیہ دیں گے۔"

"کیا وہ کام کے بعد مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ میں اسے بول دیتا ہوں۔"

پھر حشمت اس شیخ کے ساتھ جس کا نام احمد تھا اس کے گھر چلا گیا۔ شیخ احمد نے اسے اپنے گھر کی نوکرانی کے حوالے کر دیا۔

نوکرانی کا نام حفصہ تھا اور اس کا تعلق بمبئی انڈیا سے تھا۔ حفصہ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور چائے پلائی۔

چائے پلانے کے بعد وہ اسے باتھ روم لے گئی اور اسے ڈائریکشن دینے لگی۔ "حشمت۔ سب سے پہلے اس باتھ روم کی صفائی کرنی ہے۔ اس کے بعد تمام گھر کے فرش کو صاف کرنا ہے۔ بس یہی تمہارا کام ہے۔"

"لیکن ہماری طرف یہ کام تو بھنگی کرتے ہیں" حشمت نے حیران ہو کر کہا۔

"ارے بھولے بھائی۔ یہ تو سردار لوگ ہیں۔ یہاں تو خاک روب ہوتے ہی نہیں۔ یہ کام تو تارکین وطن ہی کرتے ہیں۔ دو سال قبل میں ہی حمام اور گھر وغیرہ صاف کرتی تھی لیکن جب سے میں نے باورچی خانے کا کام سنبھالا ہے۔ یہ کام انہوں نے مجھ سے چھڑا دیا ہے۔"

"لیکن یہ مغربی لیٹرین وغیرہ تو اس سے پہلے میں نے دیکھی ہی نہیں۔ پھر مجھے صفائی وغیرہ کا بھی کچھ تجربہ نہیں۔ تو اس صورت میں میں کیسے صفائی کر سکوں گا۔"

"ارے بھیا۔ اس کی ٹریننگ میں تجھے دوں گی۔"

"ٹھیک ہے بہن۔"

اور حشمت نے بادل ناخواستہ باتھ روم کی صفائی کی اور بعد میں تمام کمروں کو صاف کیا۔ کام ختم ہونے کے بعد شیخ صاحب اسے سوق فالح کے چوراہے پر چھوڑ گئے۔

○☆○

رات کو کھانا کھانے کے بعد فضل نے حشمت سے پوچھا۔ "کیوں بھائی۔ کوئی کام ملا تھا؟"

"ہاں ملا تھا..... لیکن....."

"بھائی' چپ کیوں ہو گئے' بتاؤ تو سہی۔"

"فضل بھائی' بتاؤں کیا' جتنا کام میں نے کیا ہے اتنی مزدوری نہیں ملی۔" حشمت نے شرم کے مارے کام کی نوعیت بتانے سے گریز کیا۔

"کتنی دیہاڑی ملی تھی؟"

"یہ کوئی چار دینار۔"

"ارے حشمت بھائی۔ چار دینار مزدوری تو بہت بنتی ہے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ پہلے دن ہی چار دینار کما لیے۔ پتا ہے چار دینار کے کتنے پاکستانی روپے بنتے ہیں۔ پورے تین سو روپے۔"

"ہاں فضل بھائی۔ اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا" حشمت نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز حشمت نے بہت کوشش کی اور ہر آنے والی کار کے پیچھے دوڑا تاکہ کوئی دوسرا کام مل جائے لیکن اسے کامرانی نصیب نہ ہوئی۔ تھک ہار کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے کانوں میں ہارن کی آواز پڑی۔ اس نے منہ اٹھا کر دیکھا تو اس نے دیکھا کہ اسے شیخ احمد اشارے سے بلا رہا تھا۔

حشمت بددلی کے ساتھ اٹھا۔ کار کے نزدیک پہنچا' شیخ صاحب کو سلام کیا اور چپکے سے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

شیخ احمد کے گھر پورے چھ ماہ اس نے کام کیا۔ بڑی محنت اور لگن سے۔

قطر
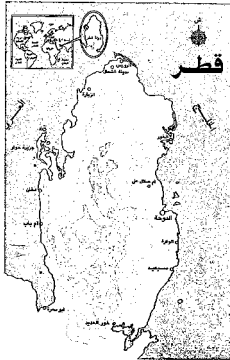
جمعہ کا دن تھا۔ جاڑا عروج پر تھا۔ موسم بھی ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حشمت لحاف اوڑھے انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی۔

"عالمی مشاعرے کا انعقاد جس میں ہندوستان۔ پاکستان۔ یو اے ای اور قطر کے معروف شاعر حصہ لے رہے ہیں۔"

عالمی مشاعرے کے انعقاد کا اشتہار پڑھتے ہی اس کے دل کا کنول کھل اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ جل اٹھے۔ اس کے ذہن کے کینوس پر ماضی کی فلم چلنے لگی۔

"حشمت کو علامہ اقبال سے قلبی لگاؤ تھا۔ اسے ان کا بیشتر کلام ازبر تھا۔ وہ اسکول کی ادبی ثقافت۔ مذہبی محافل میں نعتیہ کلام پیش کر کے خوب خراج تحسین وصول کرتا تھا۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو اسے رات کو خواب میں علامہ اقبال نے مخولہ اشعار سنائے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے فوراً حمد ثناء میں نعت لکھ ڈالی۔ اس دن وہ بہت شاداں تھا۔

تماشہ تو دیکھو کہ فردوس اعلیٰ۔ بنائے خدا اور بسائے محمدؐ
تعجب تو ہے کہ دوزخ کی آتش ۔ لگائے خدا اور بجھائے محمدؐ

خوش قسمتی سے عید میلاد النبی میں بھی صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ اس دن وہ اپنا کلام پیش کرنے کا آرزومند تھا۔ لیکن وہ تین دن اس کے لیے تین سال بلکہ تین صدیاں بن گئیں۔ وقت گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

وقت نے آخر اپنی مسافت تو طے کرنی ہی تھی۔ پھر وہ دن آپہنچا جس دن کے لیے حشمت پل پل گن گن کر گزار رہا تھا۔

تقریب ذی شان کی کاروائی کا آغاز اللہ کے بابرکت نام سے ہوا۔ تلاوت قرآن حکیم کی

سعادت تیسری جماعت کے طالب علم جمشید حسن کو حاصل ہوئی۔ تلاوت آیات ربانی کے بعد نعتیہ کلام کے لیے اس کا نام پکارا گیا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اسٹیج پر آیا۔ اس کے پورے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ورنہ اس سے قبل تو وہ بڑے جاہ وجلال کے ساتھ اسٹیج پر آتا اور تمکنت کے ساتھ کلام پیش کرکے چلا جاتا۔ لیکن اس دن تو اس کا روآں روآں کھڑا تھا۔ ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ سامعین بھی اسے نروس بریک ڈاؤن کا شکار دیکھ چکے تھے۔

پھر اس نے اپنا کلام ہلکی سی لکنت سے پڑھنا شروع کیا۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں آنے لگیں۔ تو اس میں بھی حوصلہ واعتماد آگیا۔

اس کے پرسوز و ترنم انگیز کلام نے حاضرین محفل کے کانوں میں انگبین کا رس گھول دیا۔ ان کے دلوں میں خوشیاں اتر گئیں۔

نظم پڑھنے کے بعد جب اس نے اعلان کیا کہ نظم اس نے خود بنائی تھی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جب وہ خراماں و نازاں اسٹیج سے اتر کر اپنی کرسی کی طرف آیا تو کئی ذوقین طلباء نے اس سے جذباتی انداز میں مصافحہ کیا۔

اس روز وہ بہت خوش تھا۔ اس روز کے بعد جب کبھی اس نے کسی تقریب میں حصہ لیا۔ اس نے پہلے اپنے پیرو مرشد علامہ اقبال کا کلام پیش کیا اور بعد میں اپنا کلام"

یاد گزشتہ کی فلم ختم ہوئی تو وہ اخبار ہاتھوں میں لیے ہوئے باورچی خانے میں آیا۔ اس وقت اس کا بھنوئی آملیٹ بنا رہا تھا۔

حشمت خوشیاں بکھیرتا ہوا اس سے مخاطب ہوا۔

"فضل بھائی۔ اگلے جمعہ عالمی مشاعرہ ہو رہا ہے۔ جس میں مقامی شعرا بھی اپنا کلام سنائیں گے۔۔۔ کیا میں بھی مشاعرے میں شرکت کر سکتا ہوں۔"

کیوں نہیں بھیا۔۔۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے تو مجھے دعوت نامہ بھی ملا ہے۔۔۔ میں اپنے شاعر دوست سے کہوں گا کہ وہ تجھے بھی کلام پیش کرنے کا موقع دے۔"

"سچ فضل بھائی"

"ہاں حشمت بھیا"

"تو پھر تو میرے وارے نیارے ہوگئے"

"وارے تو میرے بھی نیارے ہوگئے...میں نے سن رکھا تھا کہ حشمت تو بہت اچھا شاعر خواں ہے۔ اب پتا چلے گا کہ میرا حشمت بھائی کتنے پانی میں ہے"

فضل نے حشمت کی پھولی ہوئی گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

جمعہ سعید آیا اور عالمی مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ حسب معمول مشاعرے کا آغاز اللہ کے بابرکت نام سے ہوا۔ اس کے بعد بمطابق روایت مقامی شعراء نے اپنا کلام پیش کرنا تھا۔ چونکہ حشمت مقامی شعرا کے لیے ایک اجنبی شاعر تھا اس لیے پہلے اسے پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔

حشمت لرزتے قدموں کے ساتھ اسٹیج پر آیا۔ بسم اللہ پڑھ کر اس نے نعتیہ کلام پڑھنا شروع کیا۔ اس کی پرسوز آواز اور وجد انگیز کلام سے درودیوار میں ارتعاش آگیا۔ سامعین پر وجد طاری ہوگیا۔ وہ عش عش کر اٹھے۔

حشمت نے مشاعرہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیا۔ اس نے کلام ختم کیا تو صدر محفل نے اٹھ کر اسے گلے لگالیا اور اسے تہنیت کے پھولوں کا ہار پہنایا جو اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس نے میدان جیت لیا اس نے علاقہ غیر میں پہلے مشاعرے سے ہی اپنی پہچان کرالی وہ ایک معروف شاعر بن گیا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو قطر سے آئے ہوئے قد آور شاعر محمد فراز عظمی نے اسے قطر میں اپنی تعمیراتی کمپنی میں کام کرنے کی آفر کی۔

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے فٹ ہاں بھرلی۔

چند دنوں کے اندر عظمی صاحب نے اسے ویزا بھیج دیا۔ جھٹ منگنی جھٹ بیاہ کے مصداق حشمت اسی دن گلف ائرلائن آفس پہنچا۔ سیٹ کنفرم کرائی اور اسی دن گلف ائر کے جہاز میں بیٹھ کر قطر آگیا۔ جونہی وہ قطر انٹرنیشنل ائرپورٹ کے چھوٹے سے ارائیول لاؤنج میں داخل ہوا تو اس کا دل بجھ گیا۔ وہ سوچنے لگا "میں کہاں جنگل میں آگیا ہوں۔ کہاں کویت کا

ائرپورٹ اور کہاں قطر کا چھوٹا سا ائرپورٹ جو ایک سرائے لگتا ہے۔"

وہ کف افسوس ملنے لگا.... پھر وہ زیادہ پریشان ہوگیا جب اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش ملی۔ وہ کمرہ مٹی کی اینٹوں سے بنا ہوا تھا اور اس پر بانسوں کا چھت تھا۔ گرمی اپنے جوبن پر تھی اور وہ پسینے میں شرابور تھا۔ پنکھا تو ناپید تھا لیکن روشنی کے لیے ایک قمقمہ ضرور تھا۔

گرمی میں رات بھر وہ نہ سو سکا۔ بغیر سوئے وہ صبح کام پر چلا گیا۔ وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ٹرک میں بیٹھا۔ ٹرک چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر چلتا آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے دفتر کے سامنے رکا۔ سڑکیں نہ تھیں بلکہ پگڈنڈیاں تھیں۔

جب حشمت دفتر پہنچا تو وہ بھی اسے کباڑی کی دوکان لگا۔ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی اس نے ایک چیختی ہوئی کرسی پر کی۔

چونکہ اسے کلرکی کا جاب ملا تھا۔ اور تنخواہ بھی معقول تھی۔ لہٰذا آہستہ آہستہ اس کا دل لگ گیا۔ اور خوش خوش ہو کر کام کرنے لگا۔

○✡○

عظمی صاحب کی کمپنی میں حشمت کو کام کرتے ۶ ماہ ہی گزر پائے تھے کہ عظمی صاحب نے اپنے دولت کدے پر ایک پروقار مشاعرے کا اہتمام کیا۔ جس میں مقامی شعرا نے شرکت کی اور صدارت ایک پاکستانی اسکول کے ہیڈ ماسٹر احتشام نے کی۔

ہیڈ ماسٹر احتشام نوجوان شاعر حشمت کے کیف انگیز کلام سے بہت متاثر ہوا۔ اختتام شعری نشست وہ حشمت کے پاس آیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔ اسے وجد انگیز کلام پیش کرنے کی مبارک دی۔ پھر مشفقانہ انداز میں پوچھا۔

"بیٹا۔ تمہاری تعلیم کتنی ہے"۔

"سر۔ میں بعض ناگزیر وجوہات کے سبب بارھویں کا امتحان نہ دے سکا۔"

"ہمارے مدرسہ میں ایک کلرک کی پوسٹ خالی ہے.... اگر تم چاہو تو اسکول جوائن کر سکتے ہو"

"لیکن سر۔ تنخواہ کتنی ہوگی۔"

"جتنی تنخواہ تم اب لے رہے ہو۔ اس سے دو سو ریال زیادہ ہوگی اور رہائش وغیرہ کا بندوبست بھی مفت ہوگا"

"سر مجھے منظور ہے۔" حشمت نے مشتاقانہ انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر میں عظمی صاحب سے ابھی ہی کیوں نہ پوچھ لوں کہ وہ تمہیں ہمارے اسکول میں کام کرنے کی اجازت دیں گے یا نہیں"

"ٹھیک ہے سر"

تو پھر ہیڈ ماسٹر احتشام نوجوان سخن ور حشمت کے کفیل عظمی صاحب سے پیار بھرے انداز میں بولا۔

"عظمی صاحب۔ حشمت بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ اچھا شاعر بھی ہے۔۔ میری خواہش ہے کہ حشمت ہمارے اسکول کو جائن کرے۔ اسکول کو جائن کرنے پر ایک تو ہمارے اسکول کو اچھا کلرک مل جائے گا اور دوسرا اس کی صلاحیتوں میں نکھار آجائے گا۔۔ اس کی قسمت کا ستارہ چمک پڑے گا اور یہ قوم کا بڑا شاعر اور معمار بن کر سامنے آئے گا"

عظمی صاحب ہیڈ ماسٹر احتشام کے پر اثر دلائل سننے کے بعد مسکرائے اور گویا ہوئے

"احتشام بھائی۔ اگر حشمت کے اسکول جائن کرنے پر اس کا مستقبل سدھر رہا ہو تو مجھے بھی مسرت ہوگی۔ میری طرف سے حشمت کو اسکول میں کام کرنے کی اجازت ہے۔"

"بہت بہت مہربانی۔ عظمی صاحب۔۔" ہیڈ ماسٹر نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

"شرمندہ نہ کریں احتشام صاحب" عظمی نے ہونٹوں پر دلپذیر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

O☆O

پاکستانی اسکول کو جائن کرکے حشمت بہت خوش ہوا۔ اسے فیس جمع کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس نے خوب دل لگا کر کام کیا۔ احتشام صاحب نے اس کے کام سے متاثر ہو کر اسے

اسکول میں ملازم ہو کر حشمت کو پڑھنے لکھنے کا سنہری موقعہ مل گیا تھا۔ تب اس کے ننھے دل میں ایک ننھی آرزو نے انگڑائی لی۔

"کیوں نہ میں بارھویں جماعت کا امتحان پاس کرلوں۔"

اپنی آرزو کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ایک روز اس نے عاجزانہ انداز میں ہیڈ ماسٹر سے پوچھا۔

"سر۔ میں بطور پرائیوٹ کینڈیٹ بارھویں کا امتحان دینا چاہتا ہوں" ہیڈ ماسٹر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ارے نادان بیٹا۔ نیک کام اور وہ بھی پوچھ پوچھ کر۔ بسم اللہ کرکے پڑھائی شروع کردو۔ اللہ تیرا حامی و ناصر ہوگا۔۔۔۔ ویسے بھی اللہ میاں اسی کی مدد کرتے ہیں جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"

"سر۔ فقط آپ کی آشیرباد کی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ سے اجازت لینا ضروری سمجھا" حشمت نے سر جھکا کر کہا۔

"شاباش بیٹے۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ اگر کبھی پڑھائی میں کسی قسم کی دشواری وغیرہ پیش آئے تو مجھ سے یا کسی اور استاد سے پوچھنے میں میں جھجک و ہچکچاہٹ محسوس نہ کرنا۔" ہیڈ ماسٹر نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

تھینک یو سر۔

دوسرے سال حشمت نے اے ون گریڈ میں امتحان پاس کرلیا۔ اس نے فقط اے ون گریڈ میں امتحان ہی پاس نہیں کیا بلکہ وہ فیڈرل بورڈ اسلام آباد میں فرسٹ آیا۔ ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ کرام اس کی شاندار کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ وہ مسرور تھے کہ ان کے اسکول کے کسی ملازم نے پہلی دفعہ بطور پرائیوٹ امیدوار امتحان دیا اور بورڈ بھر میں فرسٹ آیا تھا۔ اور ان کے اسکول کو پاکستان و قطر میں شہرت و شناخت سے ہمکنار کیا تھا۔

ایک روز ہیڈ ماسٹر نے حشمت سے پیار بھرے انداز میں پوچھا۔ حشمت بیٹا۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تمہاری بدولت ہمارے اسکول کا نام روشن ہوا ہے۔ ہم مستقبل

میں بھی تیری شاندار کامیابیوں کے لیے دعا گو ہیں۔۔۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں آئندہ کے لیے تمہارا کیا ارادہ ہے۔۔۔ کیا تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہو گے۔

اگر پاکستان میں جا کر انجینئرنگ کالج میں داخلہ لو گے تو تمہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ ممکن ہے تمہارے وظیفے سے ہی تمہارے اخراجات پورے ہو جائیں۔۔۔ کیا لاہور میں داخلہ لینا پسند کرو گے یا ٹیکسلا میں"

"سر۔ میں پاکستان میں جا کر پڑھنا نہیں چاہتا۔ اگر یہاں قطر میں ڈگری یا انجن کلاس کا کوئی انتظام ہوتا تو میں ضرور تعلیم حاصل کرتا۔۔۔ لیکن فی الحال میں پاکستان میں جانا نہیں چاہتا"

"وہ کیوں" ہیڈ ماسٹر نے حیران ہو کر

"سوری سر۔ اس سوال کا جواب میں نہیں دے سکتا" حشمت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ چند لمحات کے سکوت کے بعد ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

"ایک کیمیکل کمپنی ام سعید میں چند آپریٹرز کی ضرورت ہے۔۔۔ کل ہی پاکستانی سپروائزر رفیع الدین نے مجھے بتایا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی فیس دینے آیا تھا جو دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

"اگر کہو تو سفارش کر دوں۔ بہت اچھی تنخواہ مل جائیگی۔"

"سر منظور۔۔۔۔ بہت بہت مہربانی ہوگی۔۔۔ اگر آپ مجھے بھرتی کرا دیں"

"او کے حشمت۔۔۔ اب تم دودھ پی کے سو جاؤ۔۔۔ سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا"

اور پھر حشمت کیمیکل کمپنی میں بھرتی ہو گیا۔ اچھی تنخواہ پر۔ بغیر الاونس کے ایک ہزار تین سو پچاس (۱۳۵۰) ریال تنخواہ ماہانہ۔ جو اس کی حیثیت سے بہت زیادہ تھی۔ وہ خوشیوں سے پھولا نہیں سماتا تھا۔

○☆○

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ پلک جھپکنے میں دو سال بیت گئے۔ ایک روز اس کے شفٹ سپروائزر نے اسے آفس میں بلایا اور پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "حشمت تم بہت اچھے آپریٹر

ہو۔ میں نے تمہاری سفارش کر دی ہے۔ چند دنوں میں تم سینئر آپریٹر بن جاؤ گے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ تم اکثر مغموم کیوں رہتے ہو اور پاکستان سالانہ تعطیلات پر کیوں نہیں جاتے"

"سر۔۔۔ سر" حشمت نے دل گرفتہ ہو کر صرف سر کہا۔

"ہاں۔ حشمت بولو۔۔۔۔ بلا جھجک مجھے بتا دو۔" شفٹ سپروائزر رفیع نے پیار سے پوچھا۔

اور پھر حشمت نے اپنی دل گداز بپتا اپنے سپروائزر کے گوش گزار کر دی۔ سپروائزر رفیع الدین بھی اس کی پر ملال داستان سن کر رنجور و مغموم ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد رفیع الدین نے اسے اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دی۔ حشمت نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"سر۔ آپ مجھے کھانے کی دعوت کیوں دے رہے ہیں۔ میں تو ایک معمولی سا آپریٹر ہوں اور آپ شفٹ انچارج۔"

رفیع نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"حشمت بیٹا۔ میں تیری داستان غم سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ چونکہ ڈیوٹی پر میں تم سے دل کھول کر باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے تمہیں گھر آنے کی زحمت دے رہا ہوں۔۔۔ اور ہاں اگر تم آنا نہیں چاہتے تو یہ دوسری بات ہے۔"

حشمت نے فی البدیہہ جواب دیا۔

"سر۔ آپ میرے محسن ہیں۔ آپ نے ہی مجھے بھرتی کرایا اور آپ ہی مجھے ترقی بھی دلوا رہے ہیں۔۔۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں۔۔ میں تو سر کے بل چل کر آؤں گا۔"

"شاباش بیٹے" رفیع الدین نے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"آج شام ساڑھے چھ بجے پہنچ جانا۔۔۔ کہیں بھول نہ جانا" رفیع نے پیار سے کہا۔

"ٹھیک ہے سر" حشمت نے فرمانبرداری لہجے میں جواب دیا۔

شام کا ملگجی اندھیرا چاروں اطراف پھیلا۔ تو حشمت کا دل انجانے خیالات میں مقید ہو

کر دھک دھک کرنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ رفیع الدین صاحب اس پر کیوں
مہربان ہو گئے تھے۔

پھر عین ساڑھے چھ بجے اس نے اپنے باس کے گھر کی اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔
دروازہ رفیع الدین صاحب نے ہی کھولا۔

وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

"آؤ بیٹا۔ ویلکم۔۔۔ ویلکم"

اس نے دہلیز سے اندر قدم رکھا تو ایک شفقت بھرے چہرے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ
کر خوش آمدید کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ پیکر رحمت و شفقت باس کی بیوی تھی۔

وہ ان دونوں میاں بیوی کے جلو میں ڈرائینگ روم میں آیا۔ اور ان کے ساتھ بڑے
صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے دائیں طرف رفیع الدین اور بائیں جانب مسز رفیع الدین براجمان
تھیں۔

معاً ایک پری جمال دوشیزہ ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی
حشمت حیران پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے
عین بعین زاہدہ کی ہم صورت کھڑی تھی۔

وہی کھلا کھلا چہرا۔ وہی اجلا اجلا رنگ۔ صراحی دار گردن۔ ستواں ناک۔ گلابی ہونٹ
سڈول جسم اور بلوری آنکھیں۔ اگر فرق تھا تو صرف یہ تھا کہ زاہدہ کی آنکھیں گہری ڈبھوری
تھیں اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہوش ربا حسینہ کی آنکھیں کرنجی تھیں۔

مسٹر و مسز رفیع الدین باغ باغ ہو رہے تھے کہ حشمت اٹھ کر اور بڑے غور سے ان کی
بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ شاد و مسرور تھے کہ ان کی مراد کے بر آنے کا سمہ آ چکا تھا۔

مسٹر و مسز رفیع الدین کی بیٹی چائے کی ٹرے اور بسکٹ وغیرہ رکھ کر جانے لگی۔ تو مسز
زبیدہ رفیع چاہت بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"بیٹی۔ کیا مہمان کے لیے چائے نہیں بناؤ گی۔"

ماں کا حکم بجا لانے کے لیے اس نے چائے بنانے شروع کی تو رفیع الدین نے کہا "بیٹا
حشمت۔ یہ میری اکلوتی بیٹی زاہدہ ہے۔"

زاہدہ کا نام سن کر حشمت چونکا۔ تو رفیع نے پوچھا۔

"بیٹا۔ ہکا بکا کیوں ہو گئے ہو۔"

"نہیں سر۔ کچھ نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی زاہدہ نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی تو دونوں کی نظریں
ٹکرائیں۔ زاہدہ نے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھیر کر گردن جھکائی اور ہولے ہولے
قدم اٹھاتی کمرے سے نکل آئی۔ جب کہ حشمت ٹکر ٹکر زاہدہ کو خراماں خراماں جاتے دیکھ
رہا تھا۔

"بیٹا حشمت۔ بسکٹ بھی تو کھاؤ نا" مسز زبیدہ رفیع نے خوش ہو کر کہا۔

"ہیں۔۔۔ ہوں۔۔۔ چچی جان۔۔۔ آپ نے کیا کہا؟" حشمت نے چونک کر پوچھا۔

"بیٹا۔۔۔ میں نے کہا ہے کہ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی کھاؤ"

"اچھا۔۔۔ چچی جان۔" اور اس نے لرزتے ہاتھوں سے بسکٹ اٹھالیا اور کھانے لگا۔

"سر کیا مجھے جانے کی اجازت ہے۔" حشمت نے چائے پینے کے بعد پوچھا۔

"بیٹا حشمت۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے گھر میں سر۔ سر نہ کہو۔۔۔ چچا جان کہو۔۔۔
دوسری بات یہ ہے کہ جس نیک مقصد کے لیے میں نے تمہیں گھر بلایا تھا۔ اس کا تو ابھی تک
میں نے ذکر بھی نہیں کیا۔ کیا پوچھو گے نہیں کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"سر۔ مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"بیٹا۔ تم میری شفٹ میں کام کرتے ہو۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم بہت ہی مطیع۔
محنتی و مخلص لڑکے ہو۔۔۔"

پھر وہ چپ ہو گیا۔

"سر آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں"

"میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں تم میری بات کا برا نہ مان جاؤ۔"

"سر۔ میں آپ کی بات کا کیوں برا مناؤں گا۔ آپ کی بات تو میرے لیے حکم ہے اور

آپ کا حکم سر آنکھوں پر" حشمت نے شائستگی سے کہا۔

"زاہدہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ ایف اے کا امتحان دے چکی ہے۔ اب گھر میں فارغ بیٹھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی تجھ سے کردوں بشرطیکہ تمہیں اعتراض نہ ہو۔"

اپنے ہونے والے سسر کی شیریں گفتگو نے حشمت کے کانوں میں انگبین کا رس گھول دیا۔ اس کے دل کا کنول کھل اٹھا۔ وہ خوشیوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے بولا۔

"آپ کا حکم واجب الاذعان ہے۔ ایک سپاہی کی کیا مجال کہ وہ میجر صاحب کا حکم بجالائے۔"

"جیتے رہو بیٹا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی" رفیع صاحب نے اس کی کشادہ جبین پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

مسز زبیدہ بھی اٹھیں اور انہوں نے فرط مسرت سے حشمت کا سر چوم لیا۔

OXO

حشمت نے چچا اور چچی سے جانے کی اجازت لی اور خوشی خوشی گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں شاہین سویٹ مارکیٹ سے ایک کلو مٹھائی کا ڈبہ لیا اور جھومتا جھامتا اپنے کمرے میں آپہنچا۔

ان دنوں اس کا بہنوئی فضل اسے ملنے کے لیے کویت سے قطر آیا ہوا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے مٹھائی کا ڈبہ فضل کے ہاتھ میں تھمادیا اور خود دھمال ڈالنے لگا۔ فضل اسے متحیر ہو کر ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"حشمت بھائی۔ بتاؤ تو سہی۔ یہ کس خوشی میں مٹھائی کا ڈبہ میرے ہاتھوں میں دے دیا ہے" لیکن اس نے تو کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔ وہ تو رقص کیے جا رہا تھا۔ فضل بھی اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

حشمت جب رقص کرتے کرتے تھک گیا تو پھر ہانپ کر فضل کے ساتھ مسہری پر بیٹھ گیا۔ "ارے بھائی۔ بتاؤ تو سہی۔ کہ آج چھوٹی سرکار ناچ کیوں رہی تھی۔"

"پہلے مٹھائی کھاؤ۔ تو پھر بتاؤں گا"

۔ ارے یار۔ مٹھائی تو خبر سننے کے بعد کھائی جاتی ہے۔۔۔ پہلے تم بتاؤ کہ آج تمہیں کون سا قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔"

"فضل بھائی۔۔ میری شادی ہو رہی ہے۔۔۔ وہ بھی زاہدہ رانی سے۔"

"ارے یار۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔ یا مذاق کر رہے ہو"

"نہ پاگل ہوا ہوں اور نہ مسخری کر رہا ہوں۔"

"اگر پاگل نہیں ہو گئے ہو تو پھر بتاؤ زاہدہ زندہ کیسے ہو گئی۔۔۔ اور اگر زندہ ہو گئی ہے تو وہ ان پڑھ کویت کیسے آگئی۔"

"فضل بھائی۔ زاہدہ نہ زندہ ہوئی ہے اور نہ کویت آئی ہے۔۔ لیکن میں شادی زاہدہ ۔۔۔ اپنی زاہدہ سے ہی کر رہا ہوں۔"

"یار۔ تم واقعی مخبوط الحواس لگتے ہو۔۔۔ زاہدہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے۔۔۔ پھر تمہاری زاہدہ سے کیسے شادی ہو سکتی ہے"

"اچھا۔ تم نہیں مانتے۔ تو کل میرے ساتھ چلنا۔ میں تجھے اپنی زاہدہ کو دکھادوں گا"

"ٹھیک ہے۔ میں کل ہی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

پھر دوسرے روز وہ دونوں بعد نماز عصر زاہدہ کے گھر چل دیے۔ راستے میں فضل احمد ایک خوبصورت شوروم کی طرف مڑا تو حشمت جو زاہدہ کے گھر جلدی پہنچ کر دیدار کی مسرتوں کو سمیٹنا چاہتا تھا افسردہ ہو کر بولا۔

"فضل بھائی۔ کہاں چل دیے۔"

"جیولری شاپ میں۔"

"وہ کیوں۔"

"ارے ہونق۔ کیا ہونے والی بھابھی کے گھر میں خالی ہاتھ جاؤں گا۔ وہ بھی پہلی بار۔ ہرگز نہیں۔۔۔ اور پھر اس کے گھر جانے کے لیے کوئی بہانہ بھی چاہیے ناں۔۔۔ اب ہم منگنی کے بہانے اس کے گھر جائیں گے۔۔۔ کچھ آیا بھیجے میں کہ نہیں"

فضل نے اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد فضل نے انگوٹھی خریدی اور ایک خوبصورت سا بنفشی رنگ کا چار میٹر سلوار قمیض کے لیے بنارسی سوٹ اور ارغوانی رنگ کا ململ کا دوپٹہ خریدا اور زاہدہ کے گھر پہنچ کر کال بیل دی۔

دروازہ وا ہوا تو سامنے حشمت کا چاند کھڑا تھا۔ چاند کی کرنوں سے حشمت کا دل منور ہو گیا اور فضل اسے دیکھ کر ہکا بکا ہو گیا۔

زاہدہ حیا کی چادر اوڑھے اندر چلی گئی اور فرط مسرت سے بولی۔

"ماں۔ دیکھو تو سہی کون آیا ہے۔"

"ارے پگلی۔ اسے اندر تو بلاؤ۔"

"ماں۔ اس کے ساتھ کوئی اور آدمی بھی ہے۔"

"تو کیا ہوا.... وہ آدمی ہی ہے کوئی عفریت تو نہیں ہے کہ تم ڈر رہی ہو۔" مسز زبیدہ نے کھل کر کہا۔

"لیکن ماں مجھے شرم آتی ہے۔" زاہدہ نے مدھم سی آواز میں کہا۔

"اچھا زاہدہ۔ میں ہی جاتی ہوں۔"

"خوش آمدید۔ خوش آمدید۔" مسز زبیدہ نے حشمت کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسلام علیکم۔ آنٹی جی" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو.... آؤ دونوں اندر آجاؤ۔"

ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی مسز زبیدہ رفیع نے آواز دی "بیٹی زاہدہ۔ چائے تو لاؤ۔"

زاہدہ کا نام سن کر فضل کے کان کھڑے ہو گئے۔ اب وہ جان چکا تھا کہ اس کی ہونے والی بھابھی زاہدہ ہی تھی۔ لیکن زاہدہ کی موجودگی اس کے لیے معمہ بن گئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"زاہدہ زندہ کیسے ہو گئی اور وہ مسز زبیدہ کی بیٹی کیسے بن گئی اور کویت کیسے پہنچ گئی۔"

"بیٹا۔ میں بسکٹ لے کر آتی ہوں۔" مسز زبیدہ نے کہا اور وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

"ارے۔ فضل بھائی۔ کن بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہو.... شائد سوچ رہے ہو گے کہ زاہدہ دوبارہ زندہ کیسے ہو گئی" حشمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں یار۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے.... جلدی سے اس راز سے پردہ اٹھا دو۔" فضل نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"یہ حور زاہدہ نہیں ہے.... یہ زاہدہ کی ہم شکل ہے اور میری خوش قسمتی کہ اس کا نام بھی زاہدہ ہی ہے لیکن اس کی آنکھیں نیلگوں ہیں جب کہ زاہدہ مرحومہ کی آنکھیں زردی مائل سیاہ تھیں.... ابھی چائے دینے آئے گی تو غور سے دیکھنا.... پھر تمہیں خود یقین ہو جائے گا۔"

معاماں بیٹی دونوں آگئیں۔ زاہدہ نے سلام کیا اور چائے رکھ کر جانے لگی تو فضل چاہت بھرے انداز سے بولا۔

"ٹھہرو بہن۔"

"جی بھیا۔" زاہدہ نے خندہ زیر لبی سے فضل کو دیکھا۔ اپنی خوبصورت نیلی و بلوری آنکھوں سے۔

"بہن دائیاں ہاتھ آگے کرو۔"

زاہدہ نے شرماتے ہوا اپنا دائیاں ہاتھ آگے کیا اور فضل نے اس کی مرمریں و نازک انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

"یہ کیا" مسز زبیدہ رفیع نے پوچھا۔

"آنٹی۔ یہ منگنی کی انگوٹھی ہے.... یہاں پردیس میں پیارے بھائی حشمت کا رشتہ دار کون ہے جو اس کی منگنی کی رسم ادا کرے گا.... میں اس کا بہنوئی ہوں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان دنوں اسے ملنے کے لیے کویت سے قطر آیا ہوں.... لہٰذا اس نیک کام کے سرانجام دینے میں اپنی نیک بختی اور اللہ کی خوشنودی تصور کرتا ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹا۔"

"اچھا آنٹی۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

"بیٹا۔ اب تو کھانے کا وقت ہے۔ روٹی کھا کر جاؤ۔"

"نہیں اماں۔ زاہدہ بہن کو دیکھ کر بھوک مرگئی ہے۔" فضل نے ہنس کر کہا۔

"اچھا بیٹا۔ جیسی تم دونوں کی مرضی۔" مسز زبیدہ نے اس کے شانے پر پیار سے تھپکی لگاتے ہوئے کہا۔

جب وہ گھر سے نکل رہے تھے تو زاہدہ دروازے کے اوٹ سے نکل کر انہیں جاتا ہوا دیکھ رہی تھی اور پھول کی طرح شگفتہ لگ رہی تھی۔ حشمت نے مڑ کر دیکھا تو شگفتہ پھول کو دیکھ کر وہ بھی مسکرا پڑا اور کن اکھیوں سے سلام محبت بجالایا۔

"یار تم تو بڑے خوش نصیب ہو۔" فضل نے چلتے چلتے شوخ لہجے میں کہا۔

"کاش۔ آج میری ماں زندہ ہوتی۔" حشمت نے رنجور ہو کر جواب دیا۔

"کیا ارشاد آنٹی بھی زاہدہ کی طرح زندہ ہے" فضل نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں فضل بھائی۔ بس آج ویسے ہی وہ یاد آ رہی ہیں۔ جب میں پیدا ہوا تھا تو نانی اماں نے بتایا تھا کہ وہ بہت خوش تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ میں گلاب کا پھول ہوں کہ جس کی مہک سے ان کی من کی انگنائی مہک اٹھی تھی۔"

"اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔"

افوہ۔ میں گلاب کا پھول ہی تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد کنول بن گیا۔۔ اگر میری ماں زندہ رہتی تو میں گلاب کا پھول ہی رہتا۔۔۔ میں کتنا ذہین و فطین تھا۔ اساتذہ کرام مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے۔۔۔ لیکن میری ذہانت کام نہ آئی۔۔ بلکہ قسمت نے اپنا رنگ دکھایا۔۔۔ میری قسمت بھی کنول بن گئی۔۔۔ میری کوششیں۔ میری ہمتیں۔۔۔ میری ہمتیں میری بد نصیبی سے ہار گئیں۔۔۔۔ میں کنول کا پھول جو تھا۔ کیچڑ میں اگا پھول۔ میں محنت کرتا تھا۔۔۔ میں اچھے اچھے کام کرتا تھا۔۔۔ میں خوبصورت بھی تھا خوب خصلت بھی۔ اس کے باوجود نہ خالہ ماں پیار کرتی تھی نہ باپ۔ اس لیے کہ مجھ سے کیچڑ کی بو آتی تھی۔ مجھے زرخیز مٹی نہ ملی تھی۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔۔۔ میری ذہانت۔ محنت۔ عصمت۔ انسانیت میری بری قسمت سے مات کھا گئی۔۔۔۔ اگر میری قسمت ساتھ دیتی اور میں اچھے ماحول میں پرورش پاتا تو آج بہت بڑا آدمی ہوتا۔ قوم و کشور کی خدمت کر رہا ہوتا۔۔۔ اور عزت و دولت سے کھیل رہا ہوتا۔

وہ باتیں کرتے کرتے گھر پہنچ گئے۔ انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ حشمت نے بھی باتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور افضل بھی اس کے دل کی بھڑاس سنتا رہا۔

اب تم دیکھو نا فضل بھائی۔ محنت صمیم اور عزم مصمم کہاں رنگ لاتا ہے۔ کوئی رنگ نہیں لاتا جب تک نصیب اچھے نہ ہو۔ مجھے کامل یقین ہے کہ انسان وقت کے ساتھ ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا جب تک قسمت یاوری نہ کرے۔

اب عظمت کو دیکھو۔۔۔ وہ عزت و دولت سے کھیل رہا ہے۔۔ وہ بھی میرا ہی بھائی ہے۔۔۔ وہ ذہین نہیں تھا۔ محنتی نہیں تھا۔ لیکن اسے ماحول اچھا ملا۔ اس کے نصیبوں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ آج عیش و عشرت کر رہا ہے۔ وہ قسمت کا سکندر ہے۔۔۔۔ قسمت کا سکندر۔

لگتا ہے قطر میں آ کر میرے نصیب بھی جاگ پڑے ہیں۔ آج عرصہ دراز کے بعد پھر سے کنول کھلا ہے۔۔ کنول صحرا میں کھلا ہے۔۔ اب یہ نیلگوں پھول زاہدہ کے دل کی انگنائی کو مہکائے گا۔۔۔ خدا جانے یہ نیلوفر کتنا عرصہ اس کے من میں بھینی بھینی خوشبو بکھیرتا رہے گا۔۔۔ خدا جانے۔۔ خدا جانے۔۔۔ اللہ جنت نصیب کرے میری ماں مرحومہ کو۔۔۔ وہ تو صرف دو دن اپنے کنول سے اپنے من کو مہکا سکی تھی۔۔۔ صرف دو دن۔۔۔ اور پھر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی"

"بس کرو۔۔ بس کرو حشمت اپنے بے سے لیکچر کو" فضل نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

حشمت نے شبنمی آنکھوں سے فضل کو دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

لمحاتی سکوت کے بعد فضل نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"حشمت۔ اب تو تیری قسمت جاگ پڑی ہے۔۔۔ تجھے روٹھی قسمت اور روٹی زاہدہ مل گئی ہے۔۔ پھر۔۔۔ پھر گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔۔۔ اب تو سجدہ شکر بجالا کہ تیرے ارد گرد خوشیاں ہی خوشیاں منڈلا رہی ہیں۔"

"ہاں فضل بھائی۔۔۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ دیر آید درست آید۔ لیکن اب تم میرے لیے دعا کرنا کہ یہ خوشیاں وقتی نہ ہوں بلکہ دائمی ہوں۔۔ دائمی۔"

"تم جگ جگ خوشیوں کے سمندر میں غوطے کھاتے رہو۔ لہراتے رہو اپنی زاہدہ کے سنگ۔" فضل نے کھلکھلا کر کہا۔

○✤○

امیر قطر

چند دنوں کے اندر حشمت نے اپنی لاڈلی و اکلوتی بہن انجمن کے وزیٹنگ ویزے کا بندوبست کر کے اسے قطر بلالیا اور پھر اپنے بہنوئی۔ بہن اور کثیر تعداد میں دوستوں کی موجودگی میں اپنی شادی دھوم دھام سے کرلی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرنے لگا۔ حشمت کی سینئر آپریٹر کی عہدے پر پروموشن ہو گئی تقریباً آٹھ ماہ کے بعد اس کے گلشن میں ایک خوبصورت سا پھول شہزادے کے روپ میں مسکرانے لگا۔ وہ اور اس کی بیوی زاہدہ اپنے بیٹے شہزاد علی کی جنم پر بہت خوش و خرم تھے۔ ان کے لیل و نہار مسرت سے گزرنے لگے۔

شہزاد ساڑھے تین سال کا ہوا تو اسے کے جی اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ ان ہی دنوں ۲۲ فروری ۱۹۷۲ کو صاحب سمو شیخ خلیفہ بن حمد ال تانی تخت نشین ہوئے آپ کے دل میں قطر کی محبت کوٹ کوٹ بھری تھی۔ آپ قطر کو ہر شعبے میں بام عروج پر جانے کا عزم بالجزم رکھتے تھے۔ آپ نے قطر کی ترقی و خوشحالی کے لیے دن رات ایک کر دیا جوں جوں شہزاد بڑا ہوتا گیا توں توں قطر صحت۔ صنعت۔ زراعت۔ ڈاکخانہ جات اور مواصلات وغیرہ کے شعبہ جات میں ترقی کرتا گیا۔ عین بعین حشمت کے رہن سہن میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے بخل سے ہرگز کام نہ لیا۔ اس نے اپنے گھر کا ماحول اور اسٹنڈرڈ اچھا رکھا۔ اس کے گھر میں قسم قسم کے کھانے پکتے اور وہ اس کی بیوی زاہدہ اور لڑکا شہزاد رنگ برنگے کپڑے زیب تن کرتے اور ٹھاٹ باٹ سے رہتے۔

اس کے برعکس خلیجی ممالک میں بسنے والے بیشتر تارکین وطن کے رہنے کا انداز فقیرانہ ہوتا تھا۔ ان سے تن من کے لیے بمشکل ان کی جیبوں سے پیسہ نکلتا تھا۔ ان کا پیسہ تو صرف بنکوں اور بنکوں میں جمع ہوتا تھا۔ حشمت کا اپنی ذات پر پیسہ خرچ کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا

کہ وہ فضول خرچ تھا بلکہ وہ اتنا ہی خرچ کرتا تھا جتنا کہ اسے خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ بخیل نہیں تھا۔ اس کا مطمع نظر یہ تھا "جب اللہ نے رزق دیا ہے تو اس رزق میں سے کچھ نہ کچھ ضروریات پر ضرور خرچ کرنا چاہیے۔"

حشمت کے سسر رفیع الدین بڑے کنجوس تھے۔ انہیں تو صرف پیسہ جمع کرنے کا شوق تھا۔ وردی پہن کر ڈیوٹی پر جاتے۔ ڈیوٹی سے واپس آتے تو قمیض تو اتار لیتے لیکن پینٹ اس وقت تک چڑھائے رکھتے جب تک وہ سونے کے لیے بچھونے پر نہ جاتے۔ پھر وہ سلیپنگ سوٹ پہن لیتے۔ اگر کبھی ان کا موڈ بنتا تو پینٹ اتار کر دھوتی باندھ لیتے لیکن بنا قمیض کے۔ لیکن وہ دھوتی کے اوپر بنیان ضرور پہنتے۔

اگر کبھی حشمت ان سے پوچھتا۔

"چچا جان۔ آپ خوش بخت ہیں۔ لیکن آپ خوش پوش نہیں ہیں۔ خوش خور نہیں ہیں ... آپ جو پیسہ کماتے ہیں۔ وہ تو بنکوں میں جمع ہو رہا ہے.... آخر اسے مصرف میں کیوں نہیں لاتے۔"

تو وہ ہنس کر جواب دیتے۔

"بیٹا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گوشت اور مرغن غذائیں وغیرہ کھانا صحت کے لیے نقصان دہ ہے.... کبھی سوچا تم نے کہ ہندو گوشت وغیرہ نہیں کھاتے۔ پھر بھی ان کی صحت اچھی ہوتی ہے اور وہ لحیم شحیم بھی ہوتے ہیں۔ ان کے دماغ بھی تر و تازہ ہوتے ہیں۔ وہ ترقیاں بھی پاتے ہیں۔

جب کہ ہم پاکستانی گوشت وغیرہ کھاتے ہیں۔ ہمارے دماغ بھی گوشت کی طرح موٹے ہیں۔ ہم اپنے افسروں کے ساتھ جھگڑتے ہی رہتے ہیں اور ترقی بھی نہیں کرپاتے.... ابھی تم خود ہی سوچو۔ تمہارا موجودہ شفٹ سپروائزر ہندو اور انڈر میٹرک ہے۔ اس کی سروس بھی تھوڑی ہے لیکن تمہارے بجائے اسے سپروائزر کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ اس لیے کہ وہ کوآپریٹو ہے۔ ملنسار ہے اور خوشامدی بھی....

اس طرح بہت سے اوصاف جن میں کہاں پائے جاتے ہیں اس لیے کہ وہ سبزی اور دال خورے

...اور میں بھی سپروائزر ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی سبزی خور ہوں.....

دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ سبزی و دال کھانے سے خرچہ بھی کم ہوتا۔ پیسہ بے تحاشا بڑھتا ہے۔ بینک بیلنس بڑھتا ہے تو وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔

کم خرچ بالا نشین.....

تیسری بات یہ ہے کہ گلشن اقبال لاہور میں میں نے ایک کنال کا پلاٹ خرید رکھا ہے۔ اس پر بڑا سا اور خوبصورت سا مکان بنانا ہے جس پر بہت زیادہ پیسہ خرچ ہوگا۔ اس لیے جھ سے جتنی زیادہ بچت ہو سکتی ہے کرتا ہوں۔"

○☆○

ماہ و سال آتے اور گزرتے رہے۔ شہزاد دسویں جماعت میں پہنچ گیا۔ ایک روز اس نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ابو جان۔ کتابوں میں بھی پڑھا ہے اور اکثر لوگوں سے بھی سنا ہے کہ خلیجی ممالک تو صحرا ہی صحرا ہیں۔ لیکن مجھے یہاں دوحہ۔ قطر میں تو کوئی ریگستان نظر نہیں آتا۔ یہاں تو حد نظر تک سبزہ ہی سبزہ ہے۔ خوبصورت پارک و باغات ہیں۔ سڑکوں کے دونوں کناروں پر درخت ہی درخت ہیں...

تو پھر لوگ ایسا کیوں بولتے ہیں۔ کتابوں میں جھوٹ کیوں لکھا ہے۔"

حشمت نے پیار سے شہزاد کو گلے لگایا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹا جانی۔ جنگل جمعہ مبارک ہوگا۔ تمہاری چھٹی ہوگی۔ کل ہم لمبی ڈرائیو کرکے وہاں جائیں گے جہاں اب تک تم نہیں گئے۔ وہاں پہنچ کر یقیناً تمہیں اپنے سوالوں کا جواب مل جائے گا..... ٹھیک ہے بیٹا۔"

"ٹھیک ہے ابو جان" شہزاد نے چہک کر جواب دیا۔

دوسرے دن حشمت لمبی ڈرائیو کرکے شہزاد اور اس کی ماں زاہدہ کو ام سعید لے گیا۔ ام سعید قطر کا اکلوتا صنعتی شہر ہے اور قطر کے دارلخلافہ سے ۳۵ کلو میٹر دور ہے۔ ام سعید شہر سے گزر کر وہ سمندر کے کنارے پہنچے۔ جہاں بہت سے دوسرے لوگ پکنک کے لیے آئے

ہوئے تھے۔ ام سعید کا قدرتی ساحل قطر کا سب سے دلفریب پکنک پوائنٹ ہے۔

شہزاد سمندر اور ساحل کے ساتھ ساتھ فلک بوس ریت کے ٹیلوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کا ابو ڈرائیونگ میں ماسٹر تھا۔ وہ اپنی گاڑی کو ریت کے ہر پربت کی چوٹی پر لے گیا جہاں سے ڈھلان عمودی تھی۔ جب وہ گاڑی کو ڈھلان سے نیچے لایا تو شہزاد نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں جبکہ اس کی ماں نے خوب انجوائے کیا۔ جب گاڑی نیچے آکر ساحل سمندر پر کھڑی ہوئی تو شہزاد نے آنکھیں کھولیں اور متحیر ہو کر بولا۔

"ہائے ابو۔ آپ کو گاڑی عمودی طور پر نیچے لانے میں ڈر نہیں لگا... اگر کار الٹ جاتی تو پھر ہم سب اللہ کو....." شہزاد کی بات مکمل کرنے سے پہلے حشمت ہنستے ہوئے بولا۔

"بیٹا۔ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اگر تم ماں کی طرح آنکھیں کھول کر رکھتے تو تم دیکھتے کہ تمہارا دل کتنا انجائے کرتا۔"

پھر اس نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔ دیکھ لیا صحرا..... برسا برس قبل قطر میں حد نگاہ ریت کے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے تھے۔ چیدہ چیدہ شہر مثلاً دوحہ۔ ام سعید۔ وکرہ۔ رویس۔ مدینہ شمال۔ دخان۔ ام باب وغیرہ سمندر کے کنارے پر آباد تھے۔ ان دنوں لوگوں کا روزگار مچھلی کا شکار۔ موتی پرونے اور اونٹ پالنے کا تھا۔

۱۷ مئی ۱۹۳۵ء کو قطر ڈیولپمنٹ کمپنی کے ساتھ قطر کا معاہدہ ہوا۔ جس کی رو سے کمپنی کو تیل و گیس نکالنے۔ تیل صاف کرنے اور تیل کو برآمد کرنے کے عرصہ ۷۵ سال کے حقوق مل گئے۔ اس معاہدے کی رو سے قطر کے لیے رائلٹی تین روپے فی ٹن مقرر ہوئی۔

کمپنی ہذا نے دخان کے مقام پر کنوئیں کی کھدائی شروع کی۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی گہرائی سے پانچ ہزار بیرل یومیہ کے حساب سے تیل نکلا۔ اس سے سات سال قبل یکم جون ۱۹۳۲ء کو بحرین سے تیل نکلا تھا۔

شومئی قسمت دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے وہ کنواں بند کر دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں

اٹلی کے بمبار جہازوں نے بحرین اور سعودی عرب کے آئل ویلز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن ان کے بم صحرا میں گرے اور تیل کے کنوئیں بچ گئے۔

۱۹۴۷ء میں پٹرولیم ڈویلپمنٹ کمپنی نے ڈرلنگ کا دوبارہ آغاز کیا اور دو سال کے بعد تیل کی برآمد ممکن ہو سکی۔ ۱۹۵۰ء تک قطر کے تیل کی پیداوار دو ملین ٹن سالانہ تھی جو ۱۹۵۱ء میں بڑھ کر ساڑھے تین ملین ہو گئی۔

اس کے بعد دوخان میں کمپنی کا شہر آباد ہوا اور تیل کی برآمد کے لیے دخان سے بالکل مخالف سمت ام سعید تک تیل کی لائن بچھائی گئی... یہی ام سعید جہاں کے ساحل سمندر پر تم ابھی بیٹھے ہو...

ماہ و سال گزرتے گئے اور تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوتا گیا۔ فی الحال قطر کے تیل کی پیداوار ۳۰۰۰۰۰ بیرل یومیہ اور نارتھ فیلڈ گیس کی ۸۰۰ ملین کیوبک فٹ یومیہ ہے۔"

شہزاد بڑے استغراق سے اپنے ابو کی علمی باتیں سن رہا تھا۔

حشمت قطر کے تیل کی پیداوار بتا چکا تو زاہدہ نے لقمہ دیا۔

"کیوں نہ اب تھوڑی دیر کے لیے امواج تلاطم سے دل بہلا لیا جائے۔"

"نہیں ماں نہیں۔ مجھے جنرل نالج کے باتیں سننے دو... مجھے ابو کی باتیں سن کر بہت لطف آرہا ہے۔" "ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسی تمہاری مرضی۔" زاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔ وہ دیکھو گیس پلانٹ ہے... قطر فرٹیلائزر کمپنی ہے... اس کے ساتھ ہی قطر پٹرو کیمکل کمپنی اور اس سے تھوڑی دور قطر اسٹیل کمپنی ہے... اور وہ اس طرف نیشنل آئل ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی ہے" حشمت نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے شہزاد کو بتایا۔

"ابو گیس پلانٹ کے نام سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس پلانٹ میں گیس تیار ہوتی ہوگی لیکن دوسرے پلانٹس کے بابت اگر آپ جانتے ہوں تو بتا دیں۔"

شہزاد نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں بیٹا... میں تجھے آج سب کچھ بتاؤں گا... میں جب قطر میں آیا تھا تو یہاں دوحہ میں بوسیدہ اور پرانی طرز کے مکان وغیرہ تھے۔ جو زیادہ تر کچی اینٹوں سے بنے

تھے اور چھت بانس اور کھجور کے پتوں سے۔ چھوٹی چھوٹی سڑکیں اور چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہوتی تھیں۔ خریداری کے لیے دوبئی اور قطر کی مشترکہ کرنسی دوبئی ریال استعمال ہوتا تھا۔ دوبئی قطر ریال کا اجرا ۱۹۶۶ء میں ہوا تھا۔ قبل ازاں ہندوستانی روپے میں لین دین ہوتا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں قطری ریال کا اجرا ہوا۔

۲۲ فروری ۱۹۷۲ء کو صاحب سمو شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی تخت پر بیٹھے۔ آپ کے دل میں قطر کو ہر فیلڈ میں ترقی دینے کا جذبہ موجزن تھا۔ آپ قطر کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کرنے کے آرزومند تھے... آپ نے قطر کو بے مثال ترقی و خوشحالی سے نوازا۔ تھوڑی دیر قبل جو میں نے کمپنیاں آپ کو دکھائی ہیں یہ آپ کے دور میں ہی بنی ہیں۔ یہ ان کی ہی بے مثال قیادت کا کارنامہ ہے... ابھی میں تجھے ان کمپنیوں کے بارے میں اور بعد میں دوسری ترقی کی اسکیموں کے بارے میں بتاؤں گا۔ ابھی میں این جی ایل پلانٹ (قدرتی گیس سے مائع بنانے کا پلانٹ) سے شروع کرتا ہوں۔ جو بالکل تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

این جی ایل (N.G.L)

این جی ایل ون اور این جی ایل ٹو نے ۱۹۸۰ء کے آخر میں کمرشل پروڈکشن دی۔ ان پلانٹ میں مائع قدرتی گیس کی یومیہ پیداوار کچھ یوں ہے۔ این جی ایل ون میں پروپین ۱۲۸۴ ٹن یومیہ، بوٹین ۸۵۶ ٹین یومیہ اور مکثفات ۵۸۸ ٹن یومیہ ہے۔ اور ایتھین ۳۹ مکعب فٹ یومیہ ہے۔

این جی ایل ٹو میں پروپین ۱۰۷۹ ٹن یومیہ ہے۔ بوٹین ۸۹۸ ٹن یومیہ ہے، اور مکثفات ۹۰۳ ٹن یومیہ۔ جبکہ میتھین ۱۲۷ مکعب فٹ یومیہ ہے اور ایتھین ۳۴ مکعب فٹ یومیہ ہے۔ ایتھین گیس فیڈ گیس کے طور پر قافکو اور میتھین قافکو میں استعمال ہوتی ہے۔

گیس۔ ۱۹۷۱ء میں نارتھ فیلڈ میں دریافت ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں معلوم ہوا کہ نارتھ فیلڈ جو کہ ۶۰۰۰ مربع کلو میٹر کے رقبے میں ہے دنیا کی چند بڑی فیلڈوں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۸۷ء میں دولت قطر نے نارتھ فیلڈ گیس سے استفادہ حاصل کرنے کی پلاننگ کی۔ مئی ۱۹۸۸ء میں ڈرلنگ کا آغاز ہوا سمندر کے عین درمیان جو کہ ساحلی شہر راس لفان سے ۸۰ کلو میٹر دور

ہے۔ ۸ پلیٹ فارم بنائے گئے اور وہاں سے ۸ کنوؤں کی کھدائی ہوئی۔ ہر کنوئیں سے تقریباً ۵۰ ملین مکعب فٹ گیس یومیہ نکلتی ہے۔ آج کل نارتھ فیلڈ سے ۸۰۰ ملین مکعب فٹ گیس نکل رہی ہے۔ اور یہ گیس ۳۴ پائپ لائن اور مائع گیس ۱۲ پائپ لائن سے ام سعید شہر میں واقع این جی ایل پلانٹ میں پہنچائی جاتی ہے جو کہ نارتھ فیلڈ سے تقریباً ۲۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

قطر فرٹیلائزر کمپنی (قافکو)

قافکو میں امونیا اور یوریا بنایا جاتا ہے۔

امونیا (NH) دو گیسوں نائٹروجن اور ہائیڈروجن کا مجموعہ ہے۔ امونیا میں ۸۲ فیصد نائٹروجن ہوتی ہے۔ یہ بے رنگ ہوتی ہے۔ امونیا گیس ہوا کے عام دباؤ اور منفی ۳۳ ڈگری سنٹی گریڈ پر مائع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یوریا .... یوریا، امونیا اور کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کے ملنے سے بنتا ہے۔ اس کا کیمیائی رد عمل زیادہ تر پریشر پر (3400PSIA) ہوتا ہے۔ اس کا کیمیکل فارمولہ یہ ہے۔

$$2 NH_3 + Co_2 = NH_2COONH_4 = NH_2CONH_2 + H_2O$$

یوریا میں ۴۶ فیصد نائٹروجن ہوتی ہے۔

قافکو میں دو امونیا اور دو یوریا پلانٹ ہیں۔ ہر امونیا پلانٹ میں نو سو (۹۰۰) ٹن امونیا یومیہ اور ایک ہزار ٹن یوریا یومیہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن انتظامیہ کی بہترین کارکردگی اور اسٹاف کی محنت کی بدولت دونوں پلانٹ گنجائش سے بہت زیادہ امونیا اور یوریا بنا رہے ہیں۔ اس سال دونوں امونیا پلانٹ کی پروڈکشن ۷۵۵۰۰۰ ٹن سالانہ اور یوریا کے دونوں پلانٹ کی ۸۲۲۰۰۰ ٹن سالانہ ہوئی ہے۔

امونیا اور یوریا پلانٹ نمبر ۱ کا افتتاح صاحب سمو شیخ خلیفہ بن حمدان ثانی نے ۲۳ فروری ۱۹۷۳ء کو اپنے دست مبارک سے کیا تھا۔ جبکہ امونیا کی پروڈکشن ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء اور تین ہفتے بعد یوریا کی پروڈکشن شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں امونیا تقریباً ۱۰۰۰ سالانہ اور یوریا ۱۷۰۰ ٹن سالانہ بنتا تھا۔

QATAR FERTILISER COMPANY (QAFCO) has two Ammonia and two Urea production units. Located in the country's industrial centre at Umm Said. QAFCO 1 started-up 1973. QAFCO 2 started-up 1979.

قطر فرٹیلائزر کمپنی
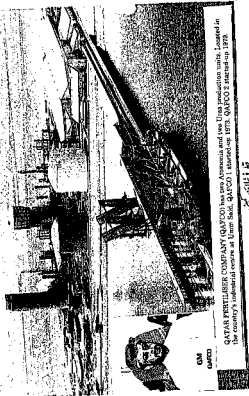
۱۹۷۹ء میں دوسرے امونیا اور یوریا پلانٹ کا افتتاح ہوا۔

یوریا بلک اسٹور یج۔ یوریا کو اسٹور کرنے کے لیے دو ہال ہیں جن کی گنجائش ۱۰۰۰۰۰ ٹن ہے۔

یوریا بیگ۔ شپ منٹ۔ چار بیگنگ لائنز۔ کانویئر سسٹم بمعہ دو شپ لوڈر ہیں۔ ان کی کپیسٹی ۲۵۰ ٹن فی گھنٹہ ہے۔

یوریا بلک شپ منٹ۔ یوریا کا وزن کیا جاتا ہے اور بلک یوریا گورنمنٹ جٹی پر کھڑے ہوئے جہاز پر ٹرانسفر کیا جاتا ہے۔ لوڈنگ کیپسٹی ۱۰۰۰ ٹن فی گھنٹہ ہے۔

پلانٹ یوٹیلیٹیز۔ ۶۳ میگاواٹ کا پاور اسٹیشن۔ ۵۰۰۰۰ کیوبک میٹر فی گھنٹہ کا سی واٹر پلانٹ۔ نائٹروجن پلانٹ کیپسٹی ۱۰۰۰ این ایم تھری فی گھنٹہ۔ جدید لیبارٹری۔ جدید سیفٹی سسٹم۔ جدید میکینکل۔ انسٹرومنٹ و الیکٹریکل شاپس ٹریننگ سیکشن۔ فنانس سیکشن۔ ڈاٹا پروسیسنگ۔ جدید میڈیکل کلینک۔ اور صاف ستھرے انتظامیہ کے دفاتر ہیں۔

امونیا ون اور یوریا ون کا کمپیوٹرائزڈ کنٹرول روم ہے۔

فاسکو

اس کمپنی نے ۱۹۷۸ء میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کی فولادی سلاخوں کی پیداوار ۳۳۰۰۰۰ ٹن سالانہ ہے لیکن آج کل کمپنی اپنے سالانہ تخمینہ سے ۷۰ فیصد کے زیادہ اسٹیل بارز بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ فاسکو کی پیداواری گنجائش ۴۰۰۰۰۰ ٹن سالانہ اور سپنج آئرن ۴۰۰۰۰۰ ٹن سالانہ ہے۔

فاپکو

فاپکو نے ۱۹۸۰ء کی آخری سہ ماہی میں پروڈکشن شروع کی۔ فیڈ اسٹاک میں ایتھین اور اسٹرپڈ گیس شامل ہے۔ جو این جی ایل مہیا کرتا ہے۔

رچ ایتھین میں ۶۰ فیصد ایتھین۔ ۲۰ فیصد میتھین اور ۲۰ فیصد ایسڈگ گیسز شامل ہیں۔ اور سٹرپڈ گیس میں ۱۵ فیصد ایتھین۔ ۶۰ فیصد میتھین۔ ۵ فیصد پروپین۔ اور ۲۰ فیصد ایسڈ گیسز ہوتی ہیں۔

این جی ایل
NGL

قافکو کی ڈیزائن کیپسٹی سالانہ یہ ہے۔ ایتھلین ۔ ۲۸۰۰۰۰ ٹن۔ ایل پی ڈی ای ۱۴۰۰۰۰ ٹن سالڈ سلفر ۳۶۰۰۰ ٹن۔

نیشنل آئل ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی (نوڈکو)

۱۹۵۴ء میں صنعتی شہر ام سعید میں ایک چھوٹی سی ریفائنری نے کام شروع کیا جس کی پیداوار صرف ۶۸۰ بیرل یومیہ تھی۔ ۱۹۷۴ء کے آخر میں پہلی جدید ریفائنری نے کام شروع کیا جس کی پیداوار ۶۳۰۰ بیرل یومیہ تھی اور پھر بتدریج اس کی پیداوار میں ۱۲۰۰۰ بیرل یومیہ تک پہنچا دی گئی۔ پھر اس ریفائنری کے ساتھ دوسری ریفائنری بنا دی گئی۔ جس نے جنوری ۱۹۸۴ء میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دوسری ریفائنری کی گنجائش ۵۰۰۰۰ بیرل یومیہ ہے۔ اب دونوں ریفائنریز بطور سنگل یونٹ آپریٹ ہوتی ہیں اور ان کی پیداوار ۶۲۰۰۰ بیرل یومیہ ہے۔ محولہ آئل ریفائنری کو چلانے۔ پروڈکٹس کو اسٹور کرنے اور مارکیٹنگ وغیرہ کا انتظام نوڈکو کرتی ہے جو ۱۹۶۸ء میں معرض وجود میں آئی۔

منطقہ صناعیہ۔ مزید برآں منطقہ صناعیہ میں چھوٹے پیمانے کے کچھ کارخانے ہیں۔ جہاں مشروبات۔ دہی۔ مکھن اور کپڑے دھونے کے پاؤڈر وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔ قطر کے شمال میں زرعی فارم بھی بنائے گئے ہیں۔ جہاں سبزیاں اور پھل کاشت ہوتے ہیں۔ دوحہ کے خربوزے اور تربوزے بہت میٹھے ہوتے ہیں۔

نیشنل فشنگ کمپنی

۱۹۸۰ء میں اس کی تعمیر نو ہوئی اور اس کمپنی میں جدید قسم کے جہازوں اور کشتیوں کا اضافہ کیا گیا تقریباً ۳۳۴۷ ٹن سالانہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔

ڈیری پروڈکٹس پراجیکٹ

اس پروجیکٹ کے تحت مویشی پالے جاتے ہیں اور یہ کئی یونٹس پر مشتمل ہے۔ اس میں ۵ ٹن دودھ اور ۱۹۳۵۲ ٹن دیگر ڈیری پروڈکٹس تیار کی جاتی ہیں۔

ابوسمرہ بھیڑوں کا فارم

یہ فارم اچھی نسل کی ۱۳۰۰۰ بھیڑ و بکریوں سے شروع کیا گیا تھا۔ جہاں سے ۵۰۰۰ سالانہ کے حساب سے بھیڑیں فروخت ہوتی تھیں۔ اب بکنے والے جانوروں کا تناسب ۱۲۶۳۰۵ تک پہنچ چکا ہے۔

گزشتہ سال قطر کو پھل۔ سبزی۔ پولٹری۔ فش۔ مکھن۔ دودھ اور انڈوں وغیرہ سے ۳۴۴۴۳۹x۱۰۰۰ ریال کی آمدنی ہوئی تھی۔

عرب قطر پولٹری کمپنی

اس پولٹری فارم سے ۳۶ ملین انڈے اور ساڑھے تین ملین چوزے سالانہ نکلتے ہیں۔

حشمت اپنے ذہین بیٹے شہزاد کو قطر کی صنعتوں کے بارے میں مکمل لیکچر دے چکا ہے تو اس نے شہزاد سے پوچھا۔ "بیٹا۔ کیا تم قطر کا رقبہ بتا سکتے ہو؟"

"نہیں ابو جی..... مجھے نہیں معلوم۔" شہزاد نے قدرے سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو میں تجھے قطر کے بارے میں چند مزید معلومات سے آگاہ کرتا ہوں۔" حشمت نے کہا۔ "شکریہ ابو جی۔" شہزاد نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"بیٹا۔ قطر ایک اسلامی و فلاحی ریاست ہے۔ قطر کی معنی ہیں "قطر باراں" یعنی موتی۔ آبادی ساڑھے تین لاکھ کے قریب ہوگی (اب چار لاکھ کے قریب ہے) ۸۰ فیصد آبادی دارالخلافہ دوحہ میں رہتی ہے۔ دوحہ کے معنی گھنے درخت کے ہیں۔ جو اس عنصر کی علامت ہیں کہ یہاں شروع میں سرسبز درخت لہلہاتے ہونگے اور باغات کی بھی فروانی ہوگی۔

قطر کا نقشہ انسانی انگوٹھے سے مشابہ ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۱۶۰ کلو میٹر اور چوڑائی ۸۰ کلو میٹر ہے۔ کل رقبہ ۱۱۴۳۷ مربع کلو میٹر ہے۔ اس کے تین اطراف میں سمندر ہے اور چوتھی سمت یعنی جنوب میں اس کی سرحد ابو ظہبی اور سعودی عرب سے ملتی ہے۔ شمال میں اس کا سمندری پڑوسی بحرین ہے جو صرف ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

قطر کا موسم مئی سے ستمبر تک گرم و مرطوب ہوتا ہے۔ اور درجہ حرارت ۴۸ سنٹی گریڈ

سے ۴۰ سنٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ اکتوبر سے اپریل تک موسم خاصا خوشگوار رہتا ہے۔ انتہائی سردی ماہ دسمبر اور جنوری میں صرف چند ہفتوں کے لیے پڑتی ہے۔ وہ بھی جب ہوائیں چلتی ہیں تو موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ موسم سرما میں درجہ حرارت ۱۱ سے ۲۲ سنٹی گریڈ تک رہتا ہے۔

قطر میں کبھی کبھار بارش ہوتی ہے۔ کبھی سردیوں میں کبھی گرمیوں میں لیکن کوئی مقررہ موسم نہیں ہے۔ بارش کا سالانہ تناسب ۷۳ ایم ایم ہے۔

قطر میں تعمیرات پر بھی خاصی توجہ دی گئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی جگہ فلک بوس عمارتیں تعمیر کردی گئی ہیں۔ چھوٹی سڑکوں کی جگہ کشادہ اور خوبصورت سڑکیں بن گئی ہیں۔ ٹریفک کی آسانی کے لیے بہت کشادہ دوراہیں۔ تعمیرات کی ترقی کا اندازہ تمام شہروں خصوصاً دوحہ اور وکرہ کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں دوحہ کی آبادی ام سعید شہر سے بھی کم تھی۔ لیکن ان دنوں دوحہ کی آبادی تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ بجلی کی کھپت پانچ میگاواٹ تھی جو اب پانچ سو اسی میگاواٹ تک، پہنچ چکی ہے۔

دوحہ جدید عمارات۔ کشادہ اور خوبصورت شاہراہ۔ سرسبز اشجار۔ دیدہ زیب پارک۔ پررونق تجارتی مراکز اور باغات کا دلکش شہر بن چکا ہے۔ انٹرنیشنل ائرپورٹ دوحہ کے ارائیول و ڈیپارچر ٹرمینل کشادہ اور خوبصورت بنا دیے گئے ہیں۔ مسافروں کے بیٹھنے کا تو معقول انتظام ہے ہی لیکن سی آف اور ریسیو کرنے والوں کے بیٹھنے کے لیے بھی کشادہ انتظار گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ جہاں مفت ٹیلیفون کرنے کے لیے سہولتیں بھی میسر کردی گئی ہیں۔ دوحہ قطر کا واحد ائرپورٹ ہے۔ جو دوحہ شہر کے مرکز سے جنوب مشرق میں سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ایئرپورٹ سے باہر کار پارکنگ کے لیے معقول سہولت موجود ہے۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلیں تو جو پہلا راؤنڈ اباؤٹ آتا ہے۔ اس سے دائیں طرف مڑیں تو آپ دوحہ شہر کی طرف چل پڑیں گے اور اگر بائیں جانب مڑیں گے تو آپ پرانے ائرپورٹ ایریا میں داخل ہو جائیں گے۔ تقریباً ۱۷ کلومیٹر کے فاصلے پر وکرہ شہر آئے گا۔ اگر سڑک پر سیدھی سمت ڈرائیو جاری رکھیں تو تقریباً ۷۳ کلومیٹر کے بعد قطر کا اکلوتا صنعتی و خوبصورت ساحلی شہر آجائیگا۔ یہاں معروف ساحلی تفریح گاہ اور نرم ریت کے بلند و بالا ٹیلوں کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔“

”ابو۔ کیا وہ تفریح گاہ یہی ہے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں۔“ شہزاد نے خوش ہو کر پوچھا۔

”شاباش بیٹا۔ یہی تفریح گاہ ہے جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔“

قطر میں آمد و رفت زیادہ تر نجی گاڑیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کی تنخواہیں زیادہ ہیں۔ وہ اپنی تنخواہ سے با آسانی گاڑی خرید سکتے ہیں۔ اب تو عورتیں بھی گاڑیاں چلا رہی ہیں۔ مزید برآں پیٹرول بھی سستا ہے۔ لہٰذا قطر میں بسنے والے ہر آدمی کے پاس ایک کار تو ضرور ہے۔

قطری شیوخ و امرا کے پاس بڑی بڑی ان گنت کاریں ہیں۔ ان کے وسیع و عریض محل بڑے خوبصورت ہیں۔ جنہوں نے دوحہ کی خوبصورتی میں خاطر خواہ اضافہ کردیا ہے۔ کئی کئی منزلہ فلیٹوں کی بہتات ہے۔

اب قطر کے معروف شہروں دوحہ۔ وکرہ۔ ام سعید۔ دخان وغیرہ میں خال خال ہی غیر تراشیدہ پتھروں اور کچے اینٹوں والے مکانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تمام پرانے مکانوں کو گرا کر جدید و خوبصورت مکانات بنا لیے گئے ہیں۔

نئے مکان بننے میں حکومت قطر کی فراخدلانہ پالیسی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جس کے مطابق ہر قطری کا پیدائشی حق ہے کہ اس کا اپنا مکان ہو۔ جو قطری مکان بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے حکومت قطر مکان بنا کر دیتی ہے اور اہلیت رکھنے والوں کو قرضوں سے نوازتی ہے تاکہ وہ خوبصورت مکان تعمیر کرا سکیں۔

پرانے انداز کی مسجدوں کی جگہ کشادہ اور خوبصورت مسجدوں نے لے لی ہے۔ جو تمام کی تمام ایئرکنڈیشنڈ ہیں۔ معروف مسجدوں میں مسجد ابوبکر صدیقؓ۔ مسجد عمر فاروقؓ۔ مسجد شیوخ اور ام سعید میں گول مسجد ہے جس میں کوئی ستون نہیں ہے۔

دوحہ کے بازار۔ شاپنگ سینٹر اور مارکیٹیں بہت کشادہ اور خوبصورت ہیں۔ اور دنیا بھر کی قسم قسم کی اشیاء سے بھری پڑی ہیں۔ معروف مارکیٹوں میں سوق فالح۔ سوق اسیری۔ سوق جبر اور سوق الدیرہ ہیں۔ جدید ترین شوروموں میں سلام بازار۔ سٹی سینٹر۔ بلیو سلیون۔ سلام بازار۔ نیشنل۔ المشیری اور نیو ورلڈ وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ شہر کے بعض حصوں میں بڑی بڑی کوآپریٹو مارکیٹیں ہیں جن میں گھریلو اشیاء ملتی ہیں۔ ان میں مشترہ اندلس۔ مدینہ

خلیفہ۔ یرموک۔ معمورہ۔ مشیرب۔ الہلال۔ دوحہ سینٹر۔ مرخیہ اور ریان وغیرہ شامل ہیں۔

مزید برآں وکرہ۔ ام سعید۔ غرافہ۔ اولڈ ائرپورٹ۔ فریق النصر۔ عالم جدید اور نجمہ وغیرہ میں بھی بڑے بڑے شاپنگ سینٹر وجود میں آچکے ہیں۔

قطر میں بجلی کا نظام بہت عمدہ ہے۔ تمام کیبل زمین دوز ہیں۔ اس لیے کھمبوں وغیرہ سے بے ڈھنگے انداز میں لٹکے ہوئے تار نہ ہونے کے سبب سڑکوں کا فضائی منظر بہت اچھا لگتا ہے۔ قطر کا پہلا پاور اسٹیشن ۱۹۶۳ء میں بنایا گیا تھا۔ اس کی بجلی کی پیداوار ۳۰ میگاواٹ تھی اب اس کی پیداوار ۲۱۰ میگاواٹ ہے۔ اور پانی ۸ ملین گیلن یومیہ بنتا ہے۔ ابو فنتاس اسٹیشن ۱۹۷۷ء میں بنایا گیا۔ جس کی پیداوار ۶۱۹ میگاواٹ ہے۔ جبکہ پانی ۲۸ ملین گیلن یومیہ بنتا ہے۔

پینے کے پانی کا بندوبست نہایت عمدہ ہے۔ پانی نہایت صاف ہوتا ہے۔ پانی کی قطعی شکایت محسوس نہیں ہوتی۔ جب باتھ روم میں جاؤ پانی ملے گا۔ نہ ہی بجلی کی شکایت ہوتی ہے۔ کبھی لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی۔

کوکنگ گیس کی فراہمی صرف سلینڈروں کے ذریعے ہوتی ہے اور سستے داموں میں میسر ہے۔ گھروں میں پائپ لائن کے ذریعے گیس پہنچانے کا منصوبہ نہیں بنایا گیا۔

ڈاک اور ٹیلی فون کا انتظام بھی بہت عمدہ ہے۔ شکایت کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ یہاں ڈاک گھر گھر تقسیم نہیں کی جاتی۔ بلکہ ہر بڑے ڈاکخانے میں پوسٹ باکس ہوتے ہیں۔ جو انفرادی طور پر لوگ الاٹ کرا لیتے ہیں۔ اگر کسی فرد کا پوسٹ بکس نہیں ہے تو وہ کسی کمپنی دفتر۔ یا کسی دوست کی وساطت سے خط منگوا سکتا ہے۔

دوحہ اور دوسرے شہروں کی سڑکیں بھی بہت عمدہ اور کشادہ بنائی گئی ہیں۔ قطر کے صدر مقام دوحہ شہر کے سڑکیں جدید طرز پر دائروں کی شکل میں بنائی گئی ہیں۔ یہ دائرہ نما سڑکیں اے رنگ۔ بی رنگ۔ سی رنگ اور ڈی رنگ کہلاتی ہیں۔ دوحہ کی تقریباً تمام سڑکیں ڈبل اور ٹریفک کے نشانات سے آراستہ ہیں۔ بعض جگہ زریں اور بالائی سڑکیں بھی ہیں۔ جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے ٹریفک کے رش میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ جس ٹرانسپورٹ نے سیدھا جانا ہوتا ہے وہ برج یا انڈر پاس سے گزر جاتی ہے اور جس نے دائیں بائیں جانا ہوتا ہے۔ وہ راؤنڈ اباؤٹ سے گزرتی ہے۔ نمایاں برج

یعنی فلائی اوور زجیدہ فلائی اور راس ابو عبود فلائی اوور زہیں جبکہ نمایاں انڈر پاس منائی ہے۔ شہر کے اندر اب کئی راؤنڈ اباؤٹ ختم کر کے ٹریفک سگنل لگا کر نہایت جدیدیت اور سہولت پیدا کر دی گئی۔ بہت خوبصورت شاہراہ شارع کارنیش ہے۔ یہ سمندر کے ساتھ ساتھ تقریباً ۷ کلومیٹر لمبی ہے۔ اور ڈبل شارع ہے۔ اگر راس ابو فلائی اوور سے ڈرائیو کریں تو یہ دائیں ہاتھ میں آتی ہے۔ سڑک کے دائیں کنارے پر سمندر کے ساتھ ساتھ دوحہ شیراٹن ہوٹل تک سبزہ لگایا گیا ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھجور کے درخت لگائے گئے ہیں۔ سبزہ کے بعد پکی اینٹوں کی گزرگاہ بنائی گئی ہے۔ جہاں پیدل چلا جا سکتا ہے۔ دوڑ لگائی جا سکتی ہے۔ سائیکل سواری کی جا سکتی ہے۔ اور سبزے پر آپ آرام فرما سکتے ہیں۔ یا یوں سمجھیں کہ پورے سات کلومیٹر کے فاصلے پر سبزہ اور پکی پگڈنڈی اور کار کی پارکنگ کا انتظام ہے۔ اس پورے علاقے میں شام سے رات گیارہ بجے تک بہت رش ہوتا ہے۔ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد اور ان کے بال بچے اذہان اور قلوب کو تازگی بخشنے کے لیے شارع کارنیش آتے ہیں۔

چونکہ شارع کارنیش کے ایک کنارے پر سمندر ہے اور سبزہ ہی سبزہ ہے۔ اس لیے لوگ سمندر کی لہروں سے خوب دل بہلاتے ہیں۔ سمندر میں آپ کو بحری جہاز اور لانچیں کھڑی نظر آتی ہیں۔ لیکن گودی پر جانے کے لیے راستہ نیو بکنگ بلڈنگ کے سامنے سے جاتا ہے۔ سمندر کے درمیان میں ایک جزیرہ پام آئی لینڈ ہے۔ اس جزیرے پر تہواروں کے موقع پر آتش بازی ہوتی ہے۔ جسے دیکھنے کے لیے گاڑیوں کا اژدحام اور لوگوں کا جم غفیر ہوتا ہے' تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔

کارنیش کے ایک کنارے پر سمندر ہے تو دوسرے کنارے پر جدید عمارتوں کا طویل سلسلہ ہے۔ رات کو جگمگاتی روشنیاں سمندر کے پانی میں منعکس ہو کر دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔

دوحہ میوزیم بھی کارنیش پر ہی واقع ہے۔ یہ راس عبود فلائی اوور سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ دوحہ میوزیم کے ساتھ ہی دوحہ کا سب سے بڑا پارک ہے۔ جس میں

آبشار۔ جھیل۔ پلیاں۔ اسکیٹنگ۔ سرکل۔ ریستوران۔ بچوں کا پارک اور مسجد وغیرہ ہیں۔

کارنیش کی دیگر عمارتوں میں بلدیہ۔ بندرگاہ۔ ہلال احمر۔ رعائیہ الشباب۔ قطر نیشنل بینک۔ گورنمنٹ ہاؤس۔ قطر مانیٹری ایجنسی۔ وزارت خارجہ۔ قصر الامیری۔ مرکزی مسجد (شیوخ)۔ کلاک ٹاور جنرل پوسٹ آفس۔ شیراٹن ہوٹل اور جی سی ہیڈ کوارٹر جیسی عمارتیں بھی شامل ہیں۔ جن میں چند بارہ چودہ منزلہ بھی ہیں۔

دیوان امیری جو مغلیہ طرز کی عمارتیں جیسی بنی ہے کے قدیم حصے کے ساتھ سفید رنگ کی نئی دیدہ زیب عمارت بھی بنا دی گئی ہے جو وہائٹ ہاؤس جیسی ہے۔

وزارت اطلاعات کی عمارت نہایت دیدہ زیب ہے اس میں بہت بڑا فنکشن ہال ہے۔

کارنش کے انتہائی سرے پر واقع شیراٹن ہوٹل فائیو اسٹار ہے اور اس کی تیرہ منزلہ عمارت نہایت خوبصورت ہے اور اہرام مصر جیسا نظارہ پیش کرتی ہے۔ اس ہوٹل کا شمار دنیا کے چند نہایت خوبصورت ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔

شیراٹن ہوٹل کے بعد وسٹ بے کا علاقہ شروع ہوتا ہے جسے وسیع منصوبہ بندی سے بنایا گیا ہے اور جہاں پر پاکستان سمیت کئی ممالک کے سفارت خانے قائم ہیں۔ یہ ویسٹ بے سفارت خانہ کی عمارتوں کے لیے مخصوص ہے۔ سفارت خانہ پاکستان کی عمارت نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس کے ساتھ ہی سفیر پاکستان کی خوبصورت رہائش گاہ بھی ہے۔

ایران پاکستان کا پڑوسی برادر ملک ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں قطر میں ایران کا سفارت خانہ بھی پاکستان کے سفارت خانہ کے ساتھ متصل ہے۔

شعبہ تعلیمات۔ تیل کی پیداوار سے قبل قطر میں مسجدوں اور گھروں میں قرآن شریف کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تیل شروع ہونے کے بعد پہلا پرائمری اسکول ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں جدید ذریعہ تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

صاحب سمو شیخ خلیفہ بن حمد آل ثانی کے امیر قطر بننے سے پہلے گنتی کے چند اسکول ہی قطر میں موجود تھے۔ آپ نے شعبہ تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی کیونکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ جب تک قطریوں کو زیور تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جائے گا۔ ملک ترقی و خوشحالی کی

منازل نہیں طے کر سکے گا۔ لہٰذا آپ کی ذاتی دلچسپی کی بدولت قطر میں اسکولوں کا جال بچھا دیا گیا۔ اسکول ہی نہیں بلکہ ٹیکنیکل اسکول اور اسلامی انسٹیٹیوٹ کامرس اسکول اور اساتذہ و معلمات کا اسکول وغیرہ بنا دیے گئے۔ ان دنوں سیکنڈری اسٹیج۔ انسٹیٹیوٹ اور یونیورسٹی انڈر گریجویشن کے طلبہ و طالبات کی تعداد ۲۲۴۰ تک پہنچ گئی ہے۔ جن میں طلبہ ۹۳۵ اور طالبات ۱۳۰۵ ہیں۔

۱۹۷۳ء میں قطر یونیورسٹی دو فلیٹی سے شروع کی گئی۔ ایک لڑکوں اور ایک لڑکیوں کے لیے۔ لیکن ۱۹۷۷ء تک بتدریج اس میں سات فلیٹی۔ چار ریسرچ سنٹرز اور ایک کمپیوٹر سنٹر کا اضافہ کر دیا گیا۔ اب یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کی تعداد تقریباً ۵۷۴۳ تک پہنچ گئی ہے جس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یعنی مختلف فلیٹیوں میں ۳۰۰۰ طالبات اور ۲۷۴۳ طلبہ زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ پچھلے سال تقریباً ۱۱۵۰ گریجویٹ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے جن میں ۲۹۹ طلبا اور ۸۵۱ طالبات شامل تھیں۔

قطر میں تعلیم بالکل مفت دی جاتی ہے۔ کتابیں۔ اسٹیشنری۔ یونیفارم۔ ٹرانسپورٹ کی سہولت اور کھیلوں کی سہولت وغیرہ ہر طالب علم کو اسکول سے یونیورسٹی لیول تک مفت دی جاتی ہیں۔

مزید برآں اعلیٰ تعلیم کے لیے مثلاً انجینیرنگ و میڈیکل کے لیے طلبہ و طالبات کو مصر۔ برطانیہ اور امریکہ وغیرہ بھی بھیجا جاتا ہے۔ گزشتہ تقریباً ۴۳۱ طلبہ اور ۳۵۹ طالبات کے اسکالرشپ پر بیرون ملک بھیجا گیا۔

دیگر ممالک کے جو باشندے قطر میں آباد ہیں ان کے بھی اپنے اپنے اسکول ہیں۔ جن میں امریکی برطانوی۔ ایرانی۔ مصری۔ بھارتی اور بنگلہ دیشی اسکول نمایاں ہیں۔

ان کے علاوہ دو پاکستانی اسکول بھی شہرت کے حامل ہیں۔ ایک پاکستانی ایجوکیشن سینٹر ہے۔ جس میں بارھویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں تقریباً ساڑھے چار ہزار طلبا و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ یہ سینٹر سفارت خانہ پاکستان کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔

دوسرا اسکول پاک شمع اسکول ہے جسے مسر محمد صدیق مرحوم نے ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا۔ غیر

ملکی اسکولوں میں یہ سب سے پرانا اسکول ہے۔ اب یہ کالج کے درجے میں اپ گریڈ کر دیا گیا
ہے۔ اس کالج میں تین ہزار کے لگ بھگ طلباء و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان دونوں
کالجوں میں اردو میڈیم کے علاوہ انگلش میڈیم کی بھی شاخیں ہیں۔ پاک شمع کالج کو ایک
گورننگ باڈی چلا رہی ہے۔ جس کے سربراہ الفرادن ایکسچینج اینڈ فنانس کے جنرل منیجر محمد
اسلم شاہد ہیں۔ جناب شاہد صاحب محب الوطن پاکستانی ہیں۔ آپ کے دل میں وطن کی محبت
کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آپ وہ کوئی موقعہ ضائع نہیں کرتے ہیں۔ جس سے وطنیت اور
قومیت کو شہرت ملتی ہو۔ آپ کی دلچسپی کے طفیل ہی پاک شمع اسکول کو کالج کا درجہ ملا ہے اور
ایک شاندار لائبریری اور لیبارٹری قائم ہوئی ہے۔ مزید بر آں آپ پاکستان کی ثقافت کو اجاگر
کرنے کے لیے دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔ رب العزت شاہد صاحب کو اجر حسنہ سے
نوازے۔

قطر میں عربی۔ فرانسیسی اور انگریزی سکھانے کے بھی کچھ ادارے ہیں۔ کمپیوٹر کی تعلیم
کا بھی معقول انتظام ہے۔ دینی تعلیم کے لیے حکومت کا ادارہ "معہد الدینی" سرگرم عمل
ہے۔ علماء میں عبداللہ ابراہیم انصاری مرحوم کا قطر میں بڑا مقام تھا۔ اب قاضی محمود اور
علامہ ڈاکٹر یوسف عزت کے مقام پر فائز ہیں۔

شعبہ صحت۔

ہر بڑے علاقے میں کلینک و اسپتال کھول دیے گئے ہیں۔ جہاں چوبیس گھنٹے علاج و
معالجہ ہوتا ہے۔ کسی قسم کی فیس یا دوائی کی قیمت نہیں لی جاتی ہے۔ اگر کسی مریض کے مرض
کی تشخیص علاقائی اسپتالوں یعنی پرائمری اسپتالوں میں نہ ہو سکے تو اس مریض کو حمد جنرل
اسپتال بھیجا جاتا ہے۔ حمد اسپتال دنیا کے چند بڑے اسپتالوں میں سے ایک ہے۔ اس کا
افتتاح ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا۔ یہاں ہر قسم کی بیماریوں مثلاً جنرل بیماری۔ دل۔ ذیابیطس۔ آرتھو
پیڈک۔ آنکھ کان۔ جنرل سرجری۔ ہارٹ سرجری۔ یورولوجی وغیرہ کا علاج کیا جاتا ہے۔ دنیا
کی جدید ترین مشینری اس اسپتال میں موجود ہے۔ اس میں ۶۳۰ بیڈ ہیں۔ اسپتال مکمل طور
پر ائر کنڈیشنڈ ہے۔ ہر کمرے میں مریض کے لیے فون۔ ٹی وی وغیرہ دستیاب ہے۔ سرجری

ڈیپارٹمنٹ میں ۲۴۰ بیڈ ہیں۔ گزشتہ سال تقریباً نو ہزار سرجیکل آپریشن ہوئے۔ اور ای این
ٹی ڈیپارٹمنٹ میں ۱۹۷ آپریشن ہوئے۔ ۱۹۸۵ میں بچوں کے لیے الاسد ہیلتھ سینٹر بنایا گیا۔
یہاں ۲۴ گھنٹے علاج ہوتا ہے۔ یہ پورے گلف میں اپنی نوعیت کا انفرادی ہیلتھ سینٹر ہے۔ اس
میں ۲۵ بسترے ہیں۔ پچھلے سال اس سنٹر میں ۲۴۹۷ بچوں کا علاج ہوا۔ ۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کو ویمن
اسپتال کا افتتاح ہوا۔ اس میں ۲۸۸ بسترے ہیں۔ ۵۵ ڈاکٹرز اور ۵۶۷ نرسز ڈیوٹی وقف ہیں۔
جہاں زچگی اور عورتوں کی دوسری بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ زچے اور بچے کی خوب
نگہداشت ہوتی ہے۔

یہ کئی منزلہ اور خوبصورت ترین عمارت ہے۔ مکمل ائر کنڈیشنڈ ہے۔ ویمن اسپتال کے
ہر کمرے میں فون اور ٹی وی کی سہولت موجود ہے۔ قطر کے تمام اسپتالوں میں علاج مفت ہوتا
ہے۔ ایکسرے۔ خون ٹیسٹ اور ای سی جی کا جدید ترین نظام موجود ہے۔ حمد اسپتال بننے سے
پہلے ہر قسم کا علاج رمیلہ اسپتال میں ہوتا تھا۔ یہ اسپتال ۱۲۰ بستروں کے ساتھ ۱۹۵۷ء میں بنا
تھا اب اس اسپتال کا انتظام حمد میڈیکل کارپوریشن کے تحت ہے۔ اب اس اسپتال میں
اپاہجوں۔ معذوروں سائیکالوجی۔ ذہنی اور جلنے والوں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اب اس
میں ۱۸۰ بیڈ ہیں۔ اور ۱۹ ایکسٹرا کمرے ہیں۔ ایک کلینک مختصر مدت کے لیے داخل ہونے
والے مریضوں کے لیے مخصوص ہے۔

قطر میں علاقے کے ہر ہیلتھ سنٹر میں ڈینٹل کا شعبہ موجود ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا ڈینٹل
اسپتال دوحہ میں موجود ہے۔ اسی طرح آنکھوں کا علیحدہ اسپتال بھی بنا دیا گیا ہے۔

تفریحات۔

لوگوں کی سیر و تفریح کے لیے تقریباً تمام علاقوں میں پارک بنا دیے گئے ہیں۔ اس کے
علاوہ منتزہ ائرپورٹ اور شارع کارنیش کے پارک بہت زیادہ شہرت کے حامل ہیں۔ جہاں
بہت زیادہ تعداد میں لوگ سیر کے لیے جاتے ہیں۔

منتزہ اور ایئرپورٹ پارک میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہے۔ جو صرف ایک ریال فی کس
ہے۔ منتزہ میں عورتوں کے لیے الگ پارک بھی ہے۔ جس میں صرف عورتیں جا سکتی ہیں۔

منتزہ ویمن پارک میں داخلہ بھی ایک ریال کے ٹکٹ پر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ چڑیا گھر۔ وکرہ پارک۔ وکرہ میوزیم۔ الخور میوزیم۔ قطر نیشنل میوزیم۔ الخور گارڈن اور کئی قلعے ہیں۔ بچوں میں ٹوائے ٹاؤن بھی خوب دیدہ زیب و مقبول ہے۔ چڑیا گھر دوحہ کے مغرب کی طرف ۲۰ کلو میٹر پر ہے۔

دوحہ میوزیم یعنی عجائب گھر دیدہ زیبی کے لحاظ سے منفرد اور آغا خان ایوارڈ یافتہ ہے۔ ابتدائی طور پر یہ مرحوم شیخ عبداللہ بن قاسم الثانی کا محل تھا جو ۱۹۰۱ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۲ میں صاحب سمو شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی نے اسے عجائب گھر بنانے کے لیے منسٹر آف پبلک ورکس کو دیا۔ ۲۳ جون ۱۹۷۵ء میں آپ نے اس کا افتتاح کیا۔ اس کے ساتھ ہی تین منزلہ نیا محل بھی بنا دیا گیا ہے۔ تھرڈ فلور لائبریری اور انتظامیہ کے لیے مخصوص ہے۔ مڈل فلور تخلیق الارض کے لیے اور گراؤنڈ فلور علم آثار قدیمہ۔ تاریخ طبعی۔ علوم و فنون۔ اسلامی سائنس کھیل۔ جدید تاریخ۔ جیولوجی وغیرہ کے لیے مخصوص ہے۔

بعض میں عجائب گھر میں میرین سیکشن کا اضافہ کیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۷ کو سمو شیخ محمد بن خلیفہ ال ثانی ولی عہد دولت قطر نے اس کا افتتاح کیا۔ اس سیکشن میں ماہی خانہ۔ موتیوں۔ ملاحہ عربیہ اور بحری مخلوقات کی نمائش گاہ وغیرہ ہے۔

قطر میں ہلکی پھلکی تفریح کے لیے چار سینما گھر بھی ہیں۔ ام سعید۔ گلف سینما۔ دوحہ سینما۔ اور امیر سینما "اوپن ایئر" ہیں۔ ان میں عربی۔ انگریزی اور بھارتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ قطر میں فیچر فلمیں نہیں بنتیں۔ البتہ عربی اسٹیج ڈرامے ضرور ہوتے ہیں۔ غانم السلیطی قطر کا مقبول اداکار ہے۔ قطر نیشنل تھیٹر ۱۹۷۵ء میں بنایا گیا۔ اس میں ۵۵۰ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ دوحہ تھیٹر بھی ہے۔ جہاں انگریزی میں اسٹیج شو ہوتے ہیں۔ عربی انگریزی اور ہندی اردو فلموں کی بے شمار وڈیو شاپس ہیں۔

حالات حاضرہ سے واقفیت اور تفریح طبع کے لئے قطر ٹی وی بھی ہے۔ بلیک اینڈ وائٹ پروگرام کی ابتدا ۱۹۷۰ء اور رنگین چینل کی ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔ عربی کے علاوہ انگریزی چینل بھی ہے۔ انگریزی چینل (۳۷) پر ہر ہفتے میں ایک بار جمعرات کو ہندی فلم دکھائی جاتی ہے۔

ہر روز ۲۱ گھنٹے کے لیے پروگرام نشر ہوتا ہے۔ ایک بار پاکستان کا معروف ڈرامہ شاہین بھی دکھایا گیا تھا۔ شروع شروع میں پاکستانی فلمیں بھی دکھائی گئیں۔ قطر ریڈیو اسٹیشن ۱۹۶۸ میں شروع ہوا۔ اب اس کی ٹرانسمشن ۴۰ گھنٹے یومیہ عربی۔ انگریزی۔ فرانسیسی اور اردو میں ہوتی ہے۔ ۱۹۸۰ میں اردو سروس شروع ہوئی۔ اردو پروگرام پیش کرنے والوں کے نام ہیں۔ جناب سیف الرحمٰن۔ جناب عبدالرحمٰن ناصر۔ محترمہ بانو سلیمان۔ محترمہ فرزانہ صفدر۔ محترمہ ثمینہ ریاض وغیرہ۔ تمام خواتین و حضرات کمال کی آواز رکھتے ہیں اور بہت بہتر پروگرام پیش کرتے ہیں۔

کھیل کود کے لیے قطر میں درجن بھر اسٹیڈیم موجود ہیں لیکن خلیفہ اسٹیڈیم بہت ماڈرن ہے اور سب سے بڑا ہے۔ اس میں ۴۵ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ یہ دوحہ سے ۷ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ فٹ بال قطر کا مقبول ترین کھیل ہے۔ اور قطر کی فٹ بال ٹیم عالمی سطح کے مقابلوں تک میں حصہ لینے کی اہل قرار دی جاتی ہے۔ فٹ بال کے کھلاڑیوں میں منصور مفتاح پانچ سو سے زائد گول کر کے اور دوبار بہترین عرب فٹ بالر ایوارڈ جیت کر سب سے نمایاں ہیں۔

قطر کے طلال منصور سو میٹر کی دوڑ میں ایشیا کے تیز ترین کھلاڑی کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ جبکہ سالم شریف نے ورلڈ باؤلنگ چیمپئن شپ میں ۲۲۳ پنوں کا ہدف پار کر کے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ قطر میں باسکٹ بال۔ والی بال اور اسکواش بھی کافی مقبول ہیں۔ ایشیائی باشندوں کی درجنوں کرکٹ ٹیمیں ہیں۔ کرکٹ کے فروغ میں انفران ایکسچینج اینڈ فنانس کمپنی کے جنرل منیجر جناب ایم شاہد اور پی آئی اے کے موجودہ جنرل منیجر جناب سید جواد حسین کی مساعی حسنہ قابل ستائش ہے۔ ہاکی اور بیڈ منٹن کے ٹورنامنٹ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان دنوں ٹینس کو بے تحاشا مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ قطر فرٹیلائزر کمپنی ہر سال قطر ٹینس ٹورنامنٹ کراتی ہے اور انعام یافتگان کو قیمتی انعامات سے نوازتی ہے۔

کار ریلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ کار ریلی میں سعد الحاجری اور عباس الموسوی بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ سالانہ کشتی ریس بھی ہوتی ہے۔

ریان میں ریس کورس ہے۔ جہاں گھوڑوں و اونٹوں کی تربیت و افزائش ہوتی ہے اور مخصوص تہواروں پر اونٹوں اور گھوڑوں کی دوڑ بھی ہوتی ہے۔ تہواروں میں عیدین کے تہوار بڑے جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں۔ کئی جگہ خصوصاً کارنش پر عوامی رقص مثلاً رقص الرزیف وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر چراغاں اور آتش بازی بھی ہوتی ہے۔ قطر کے یوم آزادی کا تہوار بھی ۳ ستمبر کو دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ صاحب سمو شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی کا یوم جلوس ۲۲ فروری کو حشمت و تمکنت سے منایا جاتا ہے۔

تہذیب و ثقافت

قطر میں سو فیصد مسلمان ہیں۔ لہٰذا قطر کا مذہب اسلام ہے۔ قطری باشندے اسلامی اصولوں کے سخت پابند ہیں۔ صوم و صلوٰت کے پابند ہیں۔ اور اپنے روایتی لباس پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ عرب حضرات کا لباس عموماً ٹخنوں تک لمبے سفید کرتے پر مشتمل ہوتا ہے جسی "ثوب" کہتے ہیں۔ ثوب کے ساتھ سر پر سفید رومال "غترہ" ہوتا ہے جسے تیز ہوا سے بچانے کے لیے اس پر دو دائروں والی قدرے وزنی سیاہ رسی "عقال" ہوتی ہے۔

عرب خواتین برقعہ پہنتی ہیں۔ بعض نقاب اوڑھ لیتی ہیں اور بعض پیشانی اور ناک پر سیاہ رنگ کا ایک چھجا "بتولہ" پہن کر بھی چہرے کا پردہ کرتی ہیں۔

قطر ربع صدی سے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا وحدہ سنگم بنا ہوا ہے۔ یہاں کئی قوموں کے افراد ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں جن کے رہن سہن۔ عادات و اطوار اور ملبوسات قطریوں سے الگ ہیں۔

ایرانی خواتین برقعہ اوڑھتی ہیں۔ مصری۔ لبنانی۔ کوریائی۔ فلپائنی اور فلسطینی عورتیں میکسی یا لانگ اسکرٹ پہنتی ہیں۔ سوڈانی عورتیں پورے جسم پر پھول دار چادریں لپیٹے ہوتی ہیں۔ جو ساڑھی کی طرح لگتی ہیں۔ برصغیر کی عورتیں شلوار قمیض میں ملبوس ہوتی ہیں۔ ہندوستانی عورتیں زیادہ تر ساڑھی باندھتی ہیں۔

سوڈانی مرد ڈھیلے ڈھالے ابراز کا بغیر کالر کا لمبا ثوب اور سر پر سفید پگڑی لیے ہوتے ہیں۔

پاکستانی ایرانی اور بلوچی شلوار قمیض کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ حضرات پینٹ قمیض بھی پہنتے ہیں۔ بنکوں اور دفتروں میں کام کرنے والے سوٹ یا سفاری سوٹ پہنتے ہیں۔ بعض بنگالی قمیض اور لنگی کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مختلف قومیتوں کے لوگ اپنے اپنے تہوار بھی منا لیتے ہیں۔ پاکستانی بھی اپنے تہوار دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ یوں تو ہر قوم نے اپنی ثقافتی تنظیمیں بنا رکھی ہیں لیکن پاکستانیوں کی بہت فعال تنظیم ہیں جو اجتماعی طور تہوار مناتی ہیں اور انہیں سفارت خانہ پاکستان کی بھرپور معاونت حاصل ہوتی ہے۔ قطر میں سرگرم پاکستانی انجمنوں میں پاکستان کلچرل کونسل۔ پاک رائٹرز فورم۔ پاک یوتھ سوسائٹی اور پاک پشتو ادبی ٹولنہ وغیرہ ہے۔

قطر میں پاکستانیوں کے آنے کا سلسلہ تقریباً ۱۹۵۰ کے عشرے میں شروع ہوا۔ چونکہ ان دنوں میں تیل کے نکل آنے سے قطر میں روزگار کے بے تحاشا مواقع پیدا ہوئے تھے لہٰذا ان دنوں پاکستانی کشاں کشاں قطر آئے۔ قطر میں زیادہ تر پاکستانی ملازمت پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تجارت کے شعبہ میں بھی چند پاکستانیوں نے خوب نام کمایا ہے۔ دوحہ میں جن علاقوں میں زیادہ پاکستانی آباد ہیں ان میں اولڈ غانم۔ دوحہ جدید۔ فریق ام غوالینہ۔ نجمہ۔ فریق عبدالعزیز اور اولڈ ائرپورٹ شامل ہیں۔

تجارت

قطر کے تجارتی تعلقات بہت سے ملکوں کے ساتھ ہیں۔ جس میں امریکا، برطانیہ و دیگر مغربی یورپ، خلیجی ممالک، مصر، جنوب مشرقی ممالک بشمول پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش ہیں۔ قطر ان ممالک سے ۴۸۴۶ ملین ریال کی اشیا درآمد کرتا ہے۔ قطر کی ۷۵ فیصد ایکسپورٹ ایشیائی ممالک، ۷ فیصد مغربی یورپین ممالک اور بقیہ عرب و دیگر ملکوں کو ہوتی ہے۔ قطر سے تیل، پیٹرو کیمیکل پروڈکٹس دبائی پروڈکٹس باہر بھیجی جاتی ہیں جبکہ بیرون ممالک سے کھانے پینے، پہننے اور دیگر لوازمات کی ہر شے درآمد کی جاتی ہے۔ سبزیاں اور پھل زیادہ تر لبنان، ایران، پاکستان،

ہندوستان اور بنگلہ دیش سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ آج کل قطر پاکستان سے ۳۳ ملین ریال کی اشیا درآمد اور ۵۳ ملین ریال کا یوریا' تیل اور پیٹرو کیمکل اشیا وغیرہ برآمد کر رہا ہے۔ چند تجار مثلاً یوسف فیملی (یوسف درویش) اور منائی فیملی (احمد منائی) کا قطر میں بڑا نام ہے۔ چند پاکستانی تجار وایکسپورٹر وامپورٹر بھی شہرت وعزت کے حامل ہیں۔ زیادہ تر تاجر کپڑے کے شعبے سے منسلک ہیں۔ کپڑے کی مشہور دکانیں رضا کلاتھ ہاؤس جناب سراج خان کی شالیمار ٹیکسٹائل اور جناب غانم شاہ کی ممتاز کلاتھ ہاؤس ہیں۔

جناب غانم شاہ صاحب کی دوحہ میں کپڑے کی چار دکانیں ہیں۔ آپ ۱۹۷۰ء میں قطر آئے تھے۔ آپ خوش اخلاق وخوش لباس ہیں۔ قطر کے علاوہ آپ کا دیگر خلیجی ممالک ابو ظہبی' دوبئی بھی کاروبار چل رہا ہے۔ آپ پاکستانی تقریبات میں ہنسی وخوشی سے شرکت کرتے ہیں اور اسپانسر بھی کرتے ہیں۔

پاکستان سے سبزیاں اور فروٹ منگوانے والوں کی بھی دکانیں ہیں۔ جن میں سرفہرست جناب محمد آصف خان کی دکان ہے۔ آپ کی سپر مارکیٹ سے تازہ بہ تازہ پاکستانی پھل اور سبزیاں ملتی ہیں۔ آپ نے ہر قسم کی کھانے پینے کی بھی پاکستانی اشیا رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً آٹا' چاول' دالیں وغیرہ۔

مٹھائی کی دکانیں بھی کافی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دکاندار خوشی کے مواقع پر پاکستان سے بھی مٹھائیاں منگواتے ہیں۔

پاکستانیوں کے ہوٹل بھی ہیں۔ جن میں شیزان کا نام سرفہرست ہے۔ چھوٹے پیمانے کے ہوٹلوں میں شالیمار' سارہ' نیو فردوس' لاہور' پشاور' لطیف اور عبدالحئی ہوٹل ہیں۔

جناب محمد صدیق صاحب: بڑے پائے کے پاکستانی تجار میں جناب میاں محمد صدیق صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ آپ کے دوحہ قطر میں نیشنل شوروم' نیشنل الیکٹرانکس' نیشنل ٹریولرز' مزدا شوروم اور شیزان ہوٹل جیسے ادارے قائم کیے ہیں۔ پاکستان میں ٹویوٹا سک گلاس فیکٹری اور توشیبا پلانٹ کے علاوہ کراچی اور لاہور میں ہوٹل بھی کھولے۔ اب آپ مستقل طور پر پاکستان جا

چکے ہیں۔

جناب محمد اکرم بٹ صاحب: ماڈرن الیکٹرک کے منیجر محمد اکرم بٹ بھی شہرت کے حامل ہیں۔ آپ کی محنت ولگن کے سبب کمپنی نے دس سال کے مختصر عرصے میں کافی ترقی کی ہے۔ اس کمپنی کے پروپرائٹر شیخ عبداللہ جاسم اثانی ہیں۔

جناب محمد خان صاحب: سانکو انٹرنیشنل کے منیجنگ ڈائریکٹر محمد خان صاحب کا کافی بول بالا ہے۔ آپ نے آج سے دس برس قبل پانچ ہزار ریال کے قلیل سرمائے سے کمپنی شروع کی اور ایک مختصر سے عرصے میں جانفشانی' محنت ولگن کے سبب ایک معروف ٹریڈنگ اینڈ کنسٹرکشن کمپنی بنائی۔ سانکو انٹرنیشنل واٹر پروفنگ' تھرمل انسولیشن' سول کنسٹرکشن اور سیوریج سسٹم کے کنسٹریکٹرز ہیں اور ہر قسم کا بلڈنگ میٹریل سپلائی کرتے ہیں۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ قطر۔ ستمبر ۱۹۷۰ء سے قطر میں کام کر رہا ہے۔ یہ ایک اہم ادارہ ہے۔ جو ترسیل زر سے پاکستان کی ترقی وخوشحالی میں برابر کا شریک ہے۔ قطر میں تقریباً چودہ بینک کام کرتے ہیں۔ جن میں آٹھ بینک فارن بینک ہیں۔ یو بی ایل تمام فارن بینکوں سے کارکردگی کے لحاظ سے چند قدم آگے ہے۔ جن کا کریڈٹ بنک افسران وعملہ کو جاتا ہے۔ بینک کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں جنرل منیجر جناب محمد یوسف۔ جنرل منیجر جناب عبدالغنی ندیم مرحوم اور موجود جنرل منیجر جناب رائے منصور احمد خان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

جناب راشد سلیم وجناب خالد چغتائی: قومی بینک کے علاوہ چند ممتاز شخصیات دوسرے بینکوں میں بھی اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ جناب راشد سلیم اسسٹنٹ جنرل منیجر قطر اسلامک بینک اور جناب خالد چغتائی منیجر دوحہ بینک دونوں شہرت وعزت کے حامل ہیں۔ دونوں محب وطن ہیں اور ملک اور ملت سے بے لوث پیار کرتے ہیں۔ قومیت اور وطنیت کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔

قومی تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور تقریبات کو اسپانسر بھی کرتے ہیں۔

جناب غلام حیدر گرنڈلے بینک میں آفیسر کے عہدے پر کام کرتے ہیں اور اپنے حلقہ احباب

میں عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ خاموش طبع ہیں اور تقریبات وغیرہ میں کم ہی حصہ لیتے ہیں۔

حبیب قطر انٹرنیشنل فنانس لیمٹڈ۔ حبیب فنانس کمپنی جو حبیب بینک کا ذیلی ادارہ ہے۔ برسہا برس سے خدمات انجام دے رہا ہے۔

الفروان ایکسچینج اینڈ فنانس کمپنی: الفروان بھی برسہا برس سے صرافہ کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے جنرل مینیجر پاکستان کے جناب محمد اسلم شاہد ہیں۔

سفارت خانہ پاکستان

پاکستان کا سفارت خانہ ۱۹۷۰ء کے عشرے سے کام کر رہا ہے۔ قطر میں پاکستان کے پہلے سفیر جناب حکیم محمد احسن تھے۔ یوں تو ہر سفیر نے اپنی بساط کے مطابق خوب کام کیا اور قطر اور پاکستان کے تعلقات میں اضافہ کیا۔ لیکن سابقہ سفیر پاکستان جناب جہاں زیب ارباب کی پاکستانی برادری کی فلاح و بہبود کے لیئے خدمات سنہری حروف سے لکھی جا چکی ہیں۔

آپ جب قطر تشریف لائے تھے تو پاکستانی اسکول جو دو ونگ بوائز ونگ و گرلز ونگ پر مشتمل تھا۔ وہ الگ الگ بوسیدہ عمارتوں میں چل رہے تھے۔ آپ نے اپنے ہم وطنوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک شاندار اسکول کی عمارت بنوائیں گے۔ تو آپ نے اپنا وعدہ مختصر سے عرصے میں پورا کر دیا اور طلبہ وطالبات کے لئے ۱۸ ملین روپے کے کثیر سرمائے سے خوب صورت عمارت تعمیر کرائی۔ اس عظیم الشان عمارت میں یکم جنوری ۱۹۸۵ء سے باقاعدہ کلاسز شروع ہوئیں اور ۶ نومبر ۱۹۸۵ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اس اعلیٰ ادارے کا افتتاح کیا۔ اس کا نام پاکستان ایجوکیشن سینٹر رکھ دیا گیا۔ اب اس کشادہ و دیدہ زیب عمارت میں جونیئر ونگ، اردو میڈیم گرلز ونگ وانگلش میڈیم گرلز ونگ۔ اردو میڈیم بوائے ونگ۔

اور انگلش میڈم بوائے ونگ چل رہے ہیں۔ موصوف سفیر نے ویسٹ بے کے خوب صورت علاقے میں سفارت خانے کی خوب صورت عمارت بھی بنوائی۔ لاریب پاکستان ایجوکیشن سینٹر کی عمارت تعمیر کرا کر آپ نے ایک بے نظیر کارنامہ سرانجام دیا۔ جس کے لئے ان کے ہم وطن ان کے ممنون احسان ہیں۔

موجودہ سفیر پاکستان جناب محمد نصیر مینگل بھی اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ آپ کا مطمع نظر برادر ملک قطر اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو مزید بہتر بنانا ہے۔ یہ آپ کا مشن ہے۔ جس میں آپ ظفر مند ہیں۔ اس غرض کے لئے کئی صوبائی و مرکزی وزراء چیئرمین سینیٹ جناب وسیم سجاد اور وزیر اعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف خان قطر کا دورہ کر چکے ہیں۔ جس کا سہرا جناب میر محمد نصیر مینگل کے سر پر ہے۔ یقیناً محولہ حضرات کے دوروں سے قطر اور پاکستان کے مابین تعلقات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

○☆○

"بیٹا شہزاد۔ میرے عملی لیکچر سے بور تو نہیں ہو گئے" قطر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد حشمت نے شہزاد سے پوچھا۔

"نہیں ابو جان۔"

"لیکن میں آپ کی باتوں سے بور ہو چکی ہوں۔ ہم نے خاک پکنک کا مزہ لوٹا ہے۔ بس سمندر کے ساحل پر بیٹھے ہیں۔ فقط بیٹھے ہیں" زاہدہ نے شکن آلود جبیں کے ساتھ کہا۔

"اری زاہدہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا ہم ساحل سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا سے اپنے اذہان کو تازہ نہیں کر رہے۔ کیا تم گھروندے بنا کر بچپن کی یادوں کو تازہ نہیں کر رہی ہو۔ کیا تم قسم قسم کے لوگوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہو رہی ہو" حشمت نے مسکرا کر کہا۔ اور اپنے کلام کو مزید جاری رکھتے ہوئے کہا "بیٹا شہزاد۔ تمہاری ماں تنگ آ چکی ہے۔ ابھی میں چند معززین پاکستانی جو مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں اور پاکستان کی پہچان ہیں کے متعلق بتا کر اپنے لیکچر کو ختم کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ابو جان" شہزاد نے بھی تھکے تھکے جواب دیا۔

ماسٹر میاں محمد رفیق صاحب:

محمد آصف خان صاحب کی سپر مارکیٹ کے متصل الشہوانی مکتبہ ہے۔ اس مکتبہ کے پروپرائٹر

ممتاز وسماجی شخصیت جناب میاں محمد رفیق صاحب ہیں۔ آپ ۱۹۵۲ء میں قطر تشریف لائے تھے اور سروس کا آغاز بطور پوسٹ ماسٹر کیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں آپ نے سروس چھوڑ دی اور کاروبار کے پیشے سے منسلک ہوگئے۔ اس کے باوجود آج تک ماسٹر کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

ابتدا میں آپ نے پاکستان سے کھانے پینے کی اشیا چاول' گڑ' دالیں' مرچ مصالحہ جات وغیرہ منگوانے شروع کئے۔ اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔

جب آپ کو محسوس ہوا کہ پاکستانیوں کو اپنے ملک کی خبریں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں تو آپ نے پاکستانیوں کی اس مشکل کو حل کیا اور پاکستان سے اخبارات' رسائل' میگزین اور درسی کتب وغیرہ منگوانے کا بیڑا اٹھایا۔ جو ایک نیک فریضہ تھا۔ اس حسن عمل سے پاکستانیوں کے دلوں میں خوشیوں کے چراغ روشن ہوگئے۔ چونکہ وہ اپنے پیارے وطن سے ہزاروں میل دور تھے۔ اپنے اعزا واقارب سے بچھڑے ہوئے تھے۔ گاؤں گلیوں' ملک کے بے نظیر نظاروں' شاداب سبزہ زاروں بل کھاتے دریاؤں' اونچے اونچے پہاڑوں' حسین وادیوں اور دیدنی آبشاروں کی دید کے لئے سیل بے آب کے مانند تڑپتے تھے اور ملکی خبریں سننے کے لئے بے چین وتاب ہوتے تھے۔ ایسے میں ماسٹر میاں محمد رفیق صاحب نے اخبارات وجرائد وغیرہ اپنے ہم وطنوں کو مہیا کرکے انہیں طمانیت ومسرت سے ہمکنار کردیا۔ اور ان کے کملائے ہوئے دلوں کو کھلا دیا اور ان میں مسرتوں کے ان گنت چراغ روشن کردیے۔

میاں صاحب صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں آپ ۱۸ حج کرچکے ہیں۔ آج کل انہوں نے اپنا کاروبار اپنے فرزندان ارجمند جناب عبدالحیٔ اور شمشاد احمد کے سپرد کررکھا ہے۔ اور خود زیادہ تر پاکستان میں رہتے ہیں۔

آپ کے پسران بھی ہمدرد دل رکھتے ہیں اور نہایت ملنسار ہیں۔ مذہبی رجحان بھی رکھتے ہیں۔ اور کاروبار سے دلچسپی بھی۔ لہٰذا کاروبار خوب چلا رہے ہیں۔ لاریب دونوں بھائی اپنے پدر گرامی کی فیروزاں شمع کو جلا بخشتے ہوئے ہیں۔

سید اشفاق حسین:

تجارت میں سید اشفاق حسین جنرل منیجر ٹیکنوٹریڈ نے خوب نام ونمود حاصل کیا۔ آپ جون ۱۹۴۳ء میں جبل پور پیدا ہوئے۔ تشکیل پاکستان کے ایک ماہ بعد ستمبر ۱۹۴۷ء میں اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان تشریف لائے۔ آپ نے روشنیوں کے شہر کراچی سے ہی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما ہولڈر ہیں۔

آپ ۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو بوقت ۵ بجے شام قطر کے دارالخلافے دوحہ پہنچے اور ماڈرن ہوم کے الیکٹرونک مصنوعات کو قطر میں انٹروڈیوس کرایا۔ آپ نے ماڈرن ہوم میں پانچ سال تک کام کیا۔

بسلسلہ تجارت ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک آپ نے پاکستان سمیت بہت سے غیر ممالک کا دورہ کیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۷۴ء کو آپ نے شاہراہ کہربا پر آڈیو ویژن کے نام سے ایک چھوٹا سا الیکٹریکل شوروم کھولا۔ پھر آپ نے مرکزی سوق الفالح میں دوسرا شوروم کھولا۔

۱۹۷۹ء میں آپ نے خالد بن علی کی شراکت میں عبداللہ بن ثانی روڈ پر بہت بڑا شوروم کھولا اور اپنے کاروبار کو بڑے پیمانے پر وسعت دی تو آپ کا شمار قطر میں بڑے بڑے تجار میں ہونے لگا۔ بعد ازاں آپ نے دوسرا کشادہ اور خوب صورت شوروم چارٹرڈ بینک کے متصل ایک خوب صورت عمارت میں کھولا اور پہلے والے دو چھوٹے شورومز کو بند کردیا۔

۱۹۹۰ء میں آپ نے اپنے نئے پارٹنر کے ساتھ مل کر کاروبار کو مزید پھیلایا اور آڈیو ویژن سے اپنے ادارے کا نام ٹیکنوٹریڈ رکھا۔ اب آپ کے شورومز بہت وسیع وکشادہ ہیں اور ان سے ہر قسم کی الیکٹریکل اشیاء مل جاتی ہیں' آپ یاماہا اور ہٹاچی الیکٹریکل مصنوعات کے ہول سیلز ایجنٹ ہیں۔ آپ نہایت خوش اخلاق' خوش گفتار' خوش پوشاک اور محب الوطن پاکستانی ہیں۔ آپ ملنساری' ہمدردی اور غمگساری جیسی صفات سے مالا مال ہیں۔

جناب عبدالحمید صاحب:

موسسہ المفتاح کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب عبدالحمید صاحب پاکستانیوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے پرنور چہرے پر ہر لمحہ مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں بکھری رہتی ہیں۔ خوش اخلاق

کے زیور سے آراستہ ہیں۔ گفتگو کرتے ہیں تو ایسے پتا چلتا ہے جیسے ہونٹوں سے شیرینی ٹپک رہی ہو۔ وطن کی محبت بھی ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جس کا ثبوت وہ ملکی و ملی تقریبات کو اسپانسر کر کے دیتے ہیں۔

آپ ۱۹۴۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ گریجویٹ ہیں، آپ نے ائر کنڈیشن انجینئرنگ میں دو سالہ پولی ٹیکنیکل کورس بھی کیا ہوا ہے۔

چونکہ آپ کے والد مرحوم دیوان امیری میں کام کرتے تھے۔ اس لئے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ ۱۹۶۴ء میں قطر آگئے۔ آپ نے قطر آکر عبداللہ عبدالغنی کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور تقریباً ۱۳ سال محنت و لگن سے کمپنی ہذا میں کام کیا۔

۱۹۷۸ء میں آپ نے محمد حسین مفتاح سے مل کر موسسہ محمد حسین مفتاح کے نام پر الیکٹریکل ٹریڈنگ اینڈ کنسٹریکٹنگ کمپنی کھولی اور محنت جیلہ و لگن حسنہ کی بدولت اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔ آپ شروع سے اب تک کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

آپ کے پانچ بچے ہیں۔ دو لڑکے امریکا اور ایک لڑکا انگلینڈ میں زیر تعلیم ہے۔ ایک لڑکی پنجاب یونیورسٹی اور دوسری لڑکی قطر میں پاکستان ایجوکیشن سینٹر میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

محمد اسلم شاہد صاحب جنرل منیجر

آپ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں قطر تشریف لائے اور گرنڈ لے بینک سے منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے الفردان ایکسچینج اینڈ فنانس کمپنی جوائن کر لی اور محنت شاقہ، مساعی حسنہ، ذہانت جمیلہ اور سلیقہ جیسی اوصاف حسنہ کی بدولت ترقی کی منازل طے کرتے کرتے منیجر کے عہدے پر براجمان ہو گئے۔ محترم حاجی محمد طفیل جنرل منیجر ۳۰ سال کا طویل عرصہ قطر گزارنے کے بعد مستقل طور پر پاکستان چلے گئے تو ان کے جانے کے بعد ۱۹۸۵ء میں آپ جنرل منیجر بن گئے۔ سچ کہتے ہیں کہ اگر عزم بالجزم، جذبہ صمیم اور رب کریم کا کرم ہو تو منزل خود بخود مل جاتی ہے۔

آپ نے اپنے ادارے کو بہت شہرت بخشی ہے۔ آپ بذات خود بھی شہرت و عزت کے ارفع مقام پر کھڑے ہیں، آپ خوش خلقی، حلیمی اور ملنساری کے زیور سے آراستہ ہیں۔ آپ اپنے

محمد اسلم شاہد صاحب

عبدالحمید صاحب

اسٹاف کے ملازم سے بھی خوش مزاجی اور متحمل مزاجی سے بات چیت کرتے ہیں۔

آپ کی سب سے بڑی صفت جو آپ کی برتری و نیک نامی کی ضوفشاں ہے وہ یہ کہ آپ پاکستانیت و قومیت کے فروغ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ آپ ملی' مذہبی و ثقافتی تقریبات کو دل کھول کر اسپانسر کرتے ہیں جو کہ جگرو گردے کا کام ہے۔

آپ بطور چیئرمین قطر کرکٹ کانفرنس گزشتہ کئی سالوں سے قطر میں کرکٹ کے فروغ کے لئے بھی سرگرم عمل ہیں۔ آپ کی محنتیں رنگ لائی ہیں اور اب قطر میں کرکٹ بھی ایک پسندیدہ کھیل بن چکا ہے۔ درجن بھر کرکٹ ٹیمیں معرض وجود میں آچکی ہیں۔ القصہ مختصر آپ قطر میں ایک درخشندہ ستارہ ہیں جن کی کرنوں سے بہت سے پاکستانیوں کے قلوب میں فیروزاں ہیں۔ رب العزت آپ کو سلامتی و عمر درازی کی دولت سے نوازے۔ آمین۔

سید جواد حسین جنرل منیجر پی آئی اے

قطر میں پی آئی اے پاکستان کا ایک اہم قومی ادارہ ہے۔ اس کی خوب صورت عمارت زیر تعمیر ہے۔ پی آئی اے پاکستانیوں کے علاوہ قطریوں اور اور دوسری قومیتوں میں اچھی شہرت وشناخت رکھتی ہے۔ اس کی کارکردگی بے مثال ہے ریزرویشن بذریعہ کمپیوٹر ہوتی ہے۔ ہفتہ میں چھ فلائٹس کراچی سے دوحہ اور دوحہ سے کراچی چلتی ہیں۔ چونکہ عیدالفطر اور عیدالضحیٰ پر اپنے ملک چھٹی جانے والوں کا کافی رش ہوتا ہے۔ لہٰذا پی آئی اے کی انتظامیہ اضافی پروازوں کا انصرام کرکے مسافروں کی بھرپور مدد کرتی ہے۔ اور کسی مسافر کو شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ اگر سہواً غلطی ہو بھی جائے تو ازالہ کرنے میں انتظامیہ عار محسوس نہیں کرتی۔ پی آئی اے کو شہرت وشناخت دینے میں پی آئی اے کے جنرل منیجر سید جواد حسین کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آپ بہ نفس نفیس ائرپورٹ پر موجود ہوتے ہیں اور ہر مسافر کو جائز تعاون پیش کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

جواد صاحب اسم بامسمی ہیں۔ مسافروں کو وزن میں چھوٹ بھی دے دیتے ہیں۔ جس سے پی آئی اے کو دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو مسافر خوش ہوجاتا ہے۔ دوسرا ہر مسافر اپنی ائرلائن پر سفر

ایک قطری لڑکا قومی لباس میں

کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

جناب جواد حسین پروقار، خوبرو اور باغ و بہار شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ آپ کی جنم بھومی زندہ دلان شہر لاہور ہے۔ آپ نے معاشیات میں ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ آپ کے گلابی چہرے پر ہروقت تبسم رقصاں رہتا ہے۔ آپ پہلی ملاقات میں ہی ملاقاتی کو اپنی گرویدگی کے حصار میں مقید کر لیتے ہیں۔

آپ اپنے عملے کی کارکردگی کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور مسافروں کی جائز شکایات و مسائل کی داد رسی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ آپ کا مطمع نظر صرف اور صرف پی آئی اے کی شہرت کو برقرار رکھنا اور ارفع مقام کو چھونا ہے۔ رب العزت انہیں اپنے بلند مقصد میں کامیاب کرے اور نیک اجر سے نوازے۔ آمین۔

جناب ایس کے عباس:

آپ کا قطر میں وسیع کاروبار ہے۔ دوحہ قطر میں آپ کے کپڑے کی چند خوب صورت دکانیں ہیں۔ جن میں رضا کلاتھ ہاؤس سرفہرست ہے۔

آپ ۲۲ مئی ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال ؒ کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ابتدائی و ثانوی تعلیم آپ نے سیالکوٹ سے حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں بی کام (ایس ایم کالج کراچی) سے کیا۔

آپ نے عملی زندگی کا آغاز آرمی انسپکشن لیبارٹری شاہراہ فیصل کراچی کی ملازمت سے کیا۔ ۱۹۷۰ء میں قطر آ گئے اور قطر چیمبر آف کامرس سے منسلک ہو گئے۔ ساڑھے تین سال کی ملازمت کے بعد آپ نے استعفیٰ دے دیا اور کپڑے کے کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ آپ محنت اور لگن کے سبب مختصر سے عرصے میں کپڑے کی تجارت کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔

پھر آپ شیخ فلاح کے فرزندان ارجمند شیخ علی بن فالح، شیخ محمد بن فالح، شیخ احمد بن فالح اور شیخ عبداللہ بن فالح کے کنسلٹنٹ مقرر ہو گئے۔ اور ان کے تعاون سے النار ٹریڈنگ اینڈ کنسٹرکشن کمپنی بنائی۔ آپ اس کمپنی کی وساطت سے ایشیائی ممالک بشمول پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور مشرق یورپ سے کموڈیٹی اشیا درآمد کرتے ہیں اور کچھ اشیا مشرقی یورپ سے منگوا کر ایشیائی

ممالک کو برآمد بھی کرتے ہیں۔ مثلاً آپ سیمنٹ بنگلہ دیش کو برآمد کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر پاکستان ان کی خدمات سے استفادہ کرے تو وہ بہت ارزاں داموں پر سیمنٹ پاکستان کو سپلائی کر سکتے ہیں یعنی صرف ۷۵ روپے فی بوری۔

عباس صاحب نے کاروبار کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ آپ تجارت کے ہر داؤ پیچ سے واقف ہیں۔ آپ نہایت خاموش طبع اور بے ضرر انسان ہیں۔ آپ گفتگو کرتے ہیں تو ناپ تول کر کرتے ہیں۔ آپ دیانت داری، فرض شناسی اور جذبہ قومی سے مالا مال ہیں۔

حشمت نے اپنے لیکچر کو ختم کرتے ہوئے کہا "بیٹا۔ قطر میں ہر شے وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ بجلی و پانی کی فراوانی ہے۔ اسکول و کالجوں کی بھرمار ہے۔ تعلیم مفت ہے۔ ہر علاقے میں ہیلتھ پرائمری یونٹ ہیں۔ امن و امان کا دور دورہ ہے۔ نہ چوری وڈاکے کا خطرہ اور نہ جان جانے کی فکر۔ قانون کی بالادستی اور ٹریفک کے باضابطہ اصول......

محولہ تمام چیزیں ترقی یافتہ ممالک میں بھی عنقا ہیں۔ لاریب قطر نے گزشتہ دو عشروں میں بے مثال ترقی کی ہے۔ اور یہ بے نظیر ترقی موجودہ امیر قطر صاحب سمو خلیفہ بن حمد ال ثانی کے مرہون منت ہے۔

ہم سب پاکستانی قطر کی ترقی و خوشحالی میں برابر کے شریک ہیں اور اس کی بے مثال ترقی پر مسرور ہیں۔ ہم قطر کو اپنا دوسرا گھر تصور کرتے ہیں۔ ہم اس عنصر پر بھی شاد و فرحاں ہیں کہ امیر دولت قطر پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ قطر کی ترقی و خوشحالی کے لئے پاکستانیوں نے اپنے قطری بھائیوں کے شانہ بشانہ کام کیا ہے۔ جو ہمارے لئے ایک اعزاز کی بات ہے۔ رب العزت قطر کو دن دونی و رات چوگنی ترقی نصیب کرے۔"

حشمت نے اپنی پراثر تقریر ختم کی تو شمس بھی نیند کی وادی میں سونے کے لئے جا چکا تھا۔ چہار سو ملگجی اندھیرے نے دبیز چادر بچھالی تھی۔ پکنک پر آنے والے دوسرے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ حشمت، شہزاد و زاہدہ نے بھی بوریا بستر سمیٹا۔ گاڑی میں بیٹھے اور گھر کی طرف چل دیئے۔

○✥○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرنے لگا۔ شہزاد نے ایف ایس سی پری میڈیکل امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ اسے علامہ اقبال میڈیکل لاہور میں داخلہ مل گیا اور وہ تمکنت و حشمت کے ساتھ اپنی تعلیمی منازل طے کرنے لگا۔ فرسٹ ائر سے سیکنڈ ائر' تھرڈ ائر اور پھر فورتھ ائر میں پروموٹ ہوا۔ تو گل بکاؤلی' وہی گل بکاؤلی جو حسین تھی' ذہین تھی لیکن شہزاد کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چپکے سے اس کے دل میں اتر گئی۔

شہزاد اپنی گل کے ساتھ اس کے گھر بھی جانے لگا۔ اس کے والدین بھی اپنی بیٹی کے کلاس فیلو سے محبت کرنے لگے۔ اس کی خاص وجہ تھی۔ ایک تو وہ خود ماڈرن تھے' وہ اپنی بیٹی پر اپنی مرضی ٹھونسنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کی خوشیاں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔ دوسرا شہزاد بھی چاند تھا۔ اس کا جسم متوازن' قد لمبا اور رنگ گورا تھا۔ اسٹیٹس بھی اچھا تھا۔ اس کا باپ قطر میں اچھے عہدے پر کام کرتا تھا اور اچھی تنخواہ لیتا تھا۔ پھر انہیں شہزاد اور گل کے ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

شہزاد جب بھی چھٹیوں میں قطر جاتا تھا تو اپنے والدین سے اپنی اور گل کی محبت کا اکثر ذکر کرتا اور اس کی ماں زاہدہ اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہتی "بیٹا۔ بیٹا تمہاری تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم تمہیں شادی کے بندھن میں باندھ دیں گے۔ تم تو ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔ تمہاری خوشیاں ہماری خوشیاں ہیں۔ تمہاری خوشیوں کو دیکھنے کے لئے ہی تو ہم زندہ ہیں۔"

"تھینک یو مما" وہ خوشیوں سے سرشار ہو کر ماں کی جبیں کو چوم لیتا۔

ان ہی دنوں میں رفیع صاحب نے اپنے بنگلے کی تعمیر شروع کرا دی۔ اس کی تیاری میں پورا ایک سال لگ گیا۔ اور لگ بھگ اس کی تزئین و آرائش پر بھی ایک سال لگا۔ کوٹھی مکمل ہوئی تو ان کے نواسے شہزاد نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرلیا۔

رفیع صاحب کو اللہ نے دوہری خوشیاں دیں تو انہوں نے پلان بنایا کہ وہ پاکستان جا کر نئے تعمیر شدہ گھر میں پروقار دعوت کا اہتمام کریں گے لہٰذا انہوں نے کارڈ چھپوا کر پاکستان میں اپنے عزیزوں دوستوں کو بھیج بھیج دیئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی منصوبہ بنایا گیا کہ رفیع صاحب بمعہ بیگم

دعوت سے پندرہ روز پہلے لاہور جائیں گے۔ پارٹی کا انتظام وغیرہ کریں گے۔ شہزاد کے ہونے والے سسرال کے گھر جا کر گل بکاؤلی کو دیکھ لیں گے اور دعوت کے دن ان دونوں کی منگنی کی بات پکی کرلیں گے۔

آخر وہ دن آگیا جس دن انہوں نے پاکستان جانا تھا۔ حشمت اور زاہدہ بھی اپنے گھر سے تیار ہو کر ان کے ہاں پہنچ گئے۔ فلائٹ سے دو گھنٹے پہلے حشمت نے ان کا سامان اپنی پجارو گاڑی میں رکھا اور یہ کہہ کر گاڑی میں براجمان ہو گئے۔

"آپ جلدی سے آئیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔"

رفیع صاحب نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور بیگم کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑے۔ رفیع نے گھر کی دہلیز کو پار بھی نہیں کیا تھا کہ انہیں سینے میں سخت درد محسوس ہوا۔ وہ کراہتے ہوئے بولے "بیگم۔ مجھے سینے میں سخت درد۔۔۔" ابھی وہ جملہ مکمل بھی نہ کرپائے تھے کہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔

بیگم رفیع الدین کے پاؤں کے نیچے سے زمین تھرکنے لگی۔ وہ حواس باختہ ہو کر چلائیں۔

"حشمت بیٹا۔ زاہدہ بیٹی۔"

حشمت اور زاہدہ ان کی چیخیں سن کر اندر آ گئے۔ دلخراش سانحے کو دیکھ کر ان پر بھی خوف و حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

حشمت نے زاہدہ اور چچی زبیدہ کی مدد سے اپنے سسر رفیع کو کار میں لٹایا اور تیزی سے گاڑی چلا کر ایمرجنسی وارڈ حمد اسپتال لے گیا۔ میڈیکل آفیسر آن ڈیوٹی نے رفیع کا معائنہ کیا اور افسردہ لہجے میں حشمت سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کا مریض مر چکا ہے۔"

حشمت اپنے سسر کی ناگہانی موت پر بہت ملول ہوا۔ زبیدہ اور زاہدہ کی بہت بری حالت تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو اور دل سے اٹھتی ہوئی آہیں تھمتی نہ تھیں۔ حشمت بے چارا دل پر جبر کی سل رکھ کر ان دونوں کو تسلیاں دیتا لیکن اس کی تسلیوں کا رتی بھر اثر نہ ہوتا۔ ان دونوں ماں بیٹی کی تو دنیا ہی اجڑ چکی تھی۔ وہ برباد ہو چکی تھیں۔ وہ آہ و بکا کر رہی تھیں۔

رفیع الدین مرحوم کی وصیت تھی کہ "اگر ان کی موت قطر میں ہی واقع ہو تو پھر انہیں قطر ہی میں دفنا دیا جائے" لہٰذا ان کی وصیت پر عمل کیا گیا اور انہیں قطر میں ہی دفنا دیا گیا۔

○☆○

حشمت اپنے سسر کی موت پر بہت رنجور و ملول تھا۔ وہ اکثر خلوت میں سوچتا تھا "رفیع الدین مرحوم نے پردیس آکر کیا کھویا' کیا پایا۔ اپنے ملک کو خیرباد کہا۔ پورے ۲۸ سال پردیس میں گزارے۔ پیٹ پر پتھر باندھے رکھا اور دال و سبزی کھاتے رہے۔ گوشت وغیرہ اسی روز پکتا جس دن مہمانوں کی دعوت ہوتی۔

لباس بھی فقیرانہ پہنتے تھے۔ گھر میں بھی ڈیوٹی کی پینٹ اور بشرٹ پہنے رکھتے تھے۔ اگر کبھی جی میں آگیا تو دھوتی و بنیان پہن لی۔ سوتے وقت شب خوابی کا لباس پہن لیتے۔ پاکستان چھٹی بھی کم جاتے تھے کیونکہ پاکستان میں تعطیلات گزارنے پر لاکھوں روپے کا خرچہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اور وہ فضول میں روپے خرچ کرنے کے سخت خلاف تھے تو پھر غیر دیس میں آکر ان کو کیا ملا۔ نہ انہوں نے اچھا کھایا پیا۔ نہ اچھا پہنا اور نہ ہی سیر و تفریح پر خرچ کیا۔

جو کچھ کمایا۔ پہلے تو وہ نیشنل بینک آف پاکستان میں جمع رہا اور پھر وہ سارا کا سارا روپیہ ایک کنال کوٹھی کی تعمیر اور اس کی تزئین و آرائش پر خرچ ہو گیا۔ جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کے بینک میں لاکھوں کے بجائے ہزاروں میں روپیہ تھا۔ بس صرف چند ہزار۔ اور کوٹھی میں رہنا تو کجا دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔

برعکس اس کے اگر وہ پاکستان میں مسکن رکھتے تو ٹھاٹ سے رہتے۔ خوش پوشاک اور خوش خور ہوتے۔ بینک بیلنس بھی مناسب ہوتا اور عزت و شہرت الگ۔

تو پھر انہیں قطر آکر کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ اپنے پیارے وطن میں تو دو گز زمین بھی نہ مل سکی۔"

پھر وہ سوچ کی گہرائیوں میں مزید دھنس گیا "کاش تارکین وطن میرے سسر کی موت سے نصیحت پکڑیں اگر اچھی تنخواہ ملتی ہے تو اچھا کھائیں اور اچھا پہنیں بھی۔۔۔

اس تنخواہ کا کیا فائدہ جسے ضروریات زندگی پر بھی خرچ نہ کیا جائے۔ ڈائٹنگ کی جائے تاکہ دل کا دورہ نہ پڑے۔ شکر کھانی چھوڑ دی جائے تاکہ ذیابیطس نہ ہو اور بیماریوں سے بچنے کے بہانے اپنے تن من پر جائز خرچ کرنا بھی چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ اچھا لباس بھی زیب تن نہ کیا جائے۔ تو ایسی دولت و امارت سے کیا فائدہ؟ اس سے اور برگشتہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ گھر تو قارون کے خزانے سے بھرا ہے لیکن تن و پیٹ خالی ہے۔۔۔۔۔۔

ہم سے تو غریب اچھے ہیں جو پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ لمبی تان کر سوتے ہیں' کیا ہوا جو جھونپڑے نما مکانوں میں رہتے ہیں۔ لیکن خوشیوں سے تو کھیلتے ہیں۔ انہیں گھر میں ڈاکہ پڑنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ انہیں ہارٹ اٹیک کا وسواس نہیں ہوتا۔ ان کا پیٹ نہیں پھولتا۔ انہیں مرنے کا خوف نہیں ہوتا۔ انہیں چوری کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ امیروں کی طرح کمروں کے اندر بند ہو کر نہیں سوتے' قید ہو کر نہیں سوتے بلکہ بے غم و بے خوف ہو کر فٹ پاتھوں پر' گلیوں میں اور چھتوں پر سوتے ہیں۔ انہیں نیند کی گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی ادھر چارپائی پر لیٹے اور فٹ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

لیکن امیر حرص زر میں دردر' گلی گلی' شہر شہر اور ملک ملک کی ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن پھر بھی وہ بھوکا ہی رہتا ہے۔۔۔۔۔۔

طمانیت کا بھوکا۔۔۔ فرحت کا بھوکا۔۔۔ شہرت کا بھوکا۔۔۔ دولت کا بھوکا۔۔۔ شعریت کا بھوکا۔۔۔ عظمت کا بھوکا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

○☆○

رفیع مرحوم کو تو قطر میں ہی دفنا دیا گیا تھا۔ لیکن بیگم زبیدہ' زاہد اور حشمت سب کی مرضی تھی کہ ان کا چالیسواں لاہور میں جا کر منایا جائے۔ اسی نو تعمیر کوٹھی میں جس پر قریب قریب انہوں نے اپنی تمام پونجی لگا دی تھی اور جس کی مالک ان کی بیٹی زاہدہ تھی۔ اکلوتی اولاد ہونے کے سبب۔

وہ سب اپنے پروگرام کے مطابق لاہور پہنچ گئے۔ شہزاد بھی ان کے آنے پر بہت خوش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان ہی دنوں میں گل بکاؤلی کے ساتھ رسم منگنی ادا ہو جائے۔ اس نے دبے

دبے لفظوں میں کئی دفعہ اپنی ماں زاہدہ کو کہا۔

"ماں۔ گل بکاؤلی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔۔۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے ڈیڈ اور ممی مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ آپ میری منگنی کر دیں نا!"

"بیٹا۔ منگنی تو تیرے نانا کے چالیسویں کے بعد کریں گے۔ لیکن آج میں' تمہاری نانی اور ابو اسے دیکھنے ضرور جائیں گے.... ٹھیک ہے نا۔"

"تھینک یو مما" شہزاد نے فرط مسرت سے مما کو چوم لیا۔

حسب پروگرام وہ تینوں گل بکاؤلی کے گھر گئے۔ اطلاعی گھنٹی کے بٹن پر حشمت نے انگلی رکھی۔ چند لمحات کے بعد ان کے نوکر نے دروازہ کھولا اور آنے کی وجہ پوچھی' تو حشمت نے وجاہت بھرے لہجے میں کہا۔ "صاحب سے کہو کہ شہزاد کے ابو' نانی اماں اور امی آئے ہیں۔"

"اچھا سرکار۔"

پھر نوکر اندر گیا اور اس نے بیگم صاحب کو بتایا "بیگم صاحب۔ شہزاد کے امی ابو آئے ہیں۔"

"اچھا۔" اس نے مسرور ہو کر کہا اور نوکر کو چائے وغیرہ بنانے کے لئے ہدایت کی۔ پھر وہ جلدی سے گل بکاؤلی کے کمرے میں گئی۔ جو حسب معمول نہا دھو کر آڈیو کیسٹ پر پاپ گانے سن رہی تھی۔

"ویلکم مما" گل بکاؤلی نے ماں کو دیکھ کر کہا۔

"بیٹی۔ جلدی سے باہر جا کر مہمانوں کو ریسیو کرو۔ میں تمہارے ڈیڈی کو اٹھاتی ہوں" نیلم نے پیار سے بیٹی کو کہا۔

"امی۔ میں..... میں مہمانوں کو ریسیو کروں گی... نوکر کہاں مر گیا ہے" گل بکاؤلی نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"بیٹی۔ اسے میں نے چائے وغیرہ تیار کرنے کے لئے کہا ہے۔ ویسے مہمان بھی تو تیرے ہی آئے ہیں ناں۔ کیا تم شہزاد کے ابو و امی کو خوش آمدید نہیں کہو گی؟" امی نے اس کے رخسار پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ماں" وہ کرسی سے اچھلی اور صدر دروازے کی طرف لپکی "آیئے آنٹی۔ آیئے انکل۔ اندر آیئے" گل بکاؤلی نے چاہت بھرے انداز میں کہا۔

موہنی سی صورت' گلابی سی رنگت اور خوب صورت سی گڑیا کو دیکھ کر حشمت کھل گیا۔ اس نے خفیف سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ "بیٹی..... تم گل بکاؤلی ہو۔"

"ہاں انکل..... پر آپ اندر تو آیئے۔"

زبیدہ' زاہدہ اور حشمت تینوں گل بکاؤلی کو دیکھ کر بہت شاد و مسرور تھے۔ وہ اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد نیلم بھی آ گئی۔ اس نے دروازے کو عبور کرنے سے پہلے ہی حشمت کو دیکھ لیا۔ وہ پہچان گئی کہ وہ کوئی غیر نہیں تھا بلکہ اس کا اپنا جیٹھ تھا۔ وہ فوراً پلٹی اور عظمت کے کمرے میں پہنچ گئی جو اس وقت میک اپ کر رہا تھا۔ عظمت نے نیلم کو دیکھا تو اس نے متحیر ہو کر پوچھا "بیگم۔ آپ گھبرائی ہوئی کیوں ہیں۔ آپ کا رنگ اڑا اڑا کیوں ہے؟"

"بات ہی ایسی ہے جی" نیلم نے لرزتے ہونٹوں سے جواب دیا۔

"کیا بات ہے۔ کچھ پتا تو لگے" عظمت نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ جو شہزاد کے ابو امی ہیں نا۔ وہ کوئی غیر نہیں ہیں۔ وہ تو حشمت بھائی اور بھابی ہیں۔"

"پھر تو ہمارے بخت جاگ گئے ہیں۔ ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ ہماری بیٹی اپنے تایا کے گھر جا رہی ہے" عظمت نے فرط مسرت سے کہا۔

"لیکن کیا۔۔۔"

"ارے چپ کیوں ہو گئی ہو۔"

"کیا حشمت بھائی ہمیں معاف کر دیں گے؟"

"ارے بیگم۔ ہم نے قصور کیا کیا ہے۔ اگر قصور کیا بھی ہے تو بڑے تو معاف کر ہی دیتے ہیں۔ بڑوں کا کام ہی معاف کرنا ہوتا ہے۔ حشمت تو میرا بھائی ہے۔ وہ مجھے ضرور معاف کر دے گا" عظمت نے سینہ پھلا کر جواب دیا۔

پھر عظمت اپنی بیگم کے ساتھ خوشی خوشی کمرے میں داخل ہوا اور مسرور لہجے میں بولا

"السلام علیکم۔ بھائی جان۔"

"وعلیکم السلام" حشمت نے کرسی سے اٹھ کر سلام کا جواب دیا۔ اس نے بھائی کو پہچان لیا معاً عظمت بھائی کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھا تو حشمت دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور ناگوار لہجے میں بولا "تم۔۔۔ تم عظمت ہو۔"

"ہاں۔ میں تمہارا بھائی عظمت ہوں۔"

"مت کہو مجھے اپنا بھائی" اس نے حقارت سے کہا اور اپنی بیوی اور خوش دامن کو لے کر واپس آگیا۔

راستے میں زبیدہ نے پوچھا "بیٹا۔ یہ جان کر ہم تو خوش ہوئے تھے کہ شہزاد بیٹے کا رشتہ کسی غیر گھر میں نہیں بلکہ اپنے چچا کے گھر میں ہو رہا ہے۔ لیکن تم نے تو ہماری خوشیوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ہماری خوشیوں کو ہی نہیں بلکہ شہزاد کی خوشیوں کو بھی۔"

"عظمت نے تو تجھے بڑے اچھے طریقے سے ویلکم کیا لیکن تیرے ناروا سلوک کو ہم سب نے بری طرح محسوس کیا۔ لیکن تیری عزت و آبرو کی خاطر میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ لیکن گھر جانے سے پہلے اتنا ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں کون سا گہرا زخم عظمت نے لگایا ہے کہ جو ابھی تک بھرا نہیں۔۔۔ ذرا میں بھی تو جانوں۔"

"ماں۔ عظمت ہماری خوشیوں کا قاتل ہے۔ وہ امی و ابو کی خوشیوں کا بھی قاتل ہے۔ والدین نے اسے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ وہ بڑا آدمی بن گیا تو اس نے ہم سب کو بھلا دیا۔ وہ نانے کے مرنے پر نہ آیا۔ نانی مر گئی تو نہ آیا۔ امی اور ابو اللہ کو پیارے ہو گئے تو نہ آیا۔ اگر گھر آیا تو جائیداد بیچ کر واپس چلا گیا۔"

حشمت نے روہانسا ہو کر الف سے لے کر ی تک اپنی دکھ بھری کہانی سنا دی۔

"بیٹا، یہ کوئی گناہ نہیں، ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ ایسا گناہ نہیں کہ اس کی سزا شہزاد و گل بکاؤلی کو دی جائے" زبیدہ نے شبنمی آنکھوں سے کہا۔

"نہیں ماں، نہیں ماں۔ ایسا مت کہو۔ میرے غیرت مند شوہر نے جو فیصلہ کیا ہے۔ ٹھیک کیا ہے۔ اب شہزاد کی شادی گل بکاؤلی کے ساتھ نہیں ہوگی" زاہدہ جو چپ چاپ ماں

اور خاوند کی باتیں سن رہی تھی سیلابی آنکھوں کے ساتھ بولی۔

"نہیں بیٹی۔۔۔ ایسا مت کہو۔ شہزاد اور گل بکاؤلی کو اتنی کڑی سزا مت دو۔" زبیدہ نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں جانی۔ یہ شادی نہیں ہوگی، نہیں ہوگی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے" حشمت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

معاً ان کا گھر بھی آگیا۔ حشمت نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ زبیدہ اور زاہدہ بھی سر جھکائے اندر داخل ہوئے تو شہزاد رنجور ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کالا ہے۔

جب اس کی امی۔ ابو اور نانی ڈرائنگ روم میں براجمان ہو گئے تو اس نے لب کشائی کی۔ "ابو کیا ہوا۔ آپ ملول دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ہی نہیں بلکہ امی جان اور نانی جان کے چہرے بھی پیلے پڑ گئے ہیں۔ کیا بات ہے، پلیز کچھ بتائیے تو سہی۔ آپ لوگ تو خوشی خوشی گل بکاؤلی کو دیکھنے گئے تھے۔ ایک حور کو دیکھنے گئے تھے۔ آپ لوگوں کو تو خوش خوش لوٹنا چاہئے تھا۔ کیونکہ جو کوئی بھی میری حورا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہشاش بشاش ہو جاتا ہے اس کا دل کھل و مہک اٹھتا ہے لیکن آپ کے چہروں پر ہوائیاں اڑ۔"

ابھی شہزاد اپنا جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ حشمت نے ترش لہجے میں کہا۔

"بس کرو شہزاد۔ بس کرو۔ اپنا لیکچر بند کرو۔ میں ایک جملے میں تمہارے لیکچر کا جواب دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ تمہارا بیاہ گل بکاؤلی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا، آخر کیوں؟" شہزاد نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بے شرم اپنے باپ کے ساتھ آنکھیں نیچے کر کے بات کرو" زاہدہ نے غصے سے کہا۔

"نہیں مجھے اپنے حق کے لئے لڑنا بھی پڑا تو لڑوں گا" شہزاد نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا اور پھر وہ روکھے انداز میں باپ سے مخاطب ہوا۔ "بابا جانی۔ یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی۔ گل بکاؤلی میری ہے اور میری رہے گی۔ اگر آپ میری شادی نہیں کریں گے تو

میں آپ کا گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ کیا آپ کو منظور ہے۔ شادی منظور ہے یا میرا گھر چھوڑ کر چلا جانا' جواب دیں... جواب دیں۔"

حشمت اپنے اکلوتے بیٹے کی باتیں سن کر بپھر گیا۔ ویسے بھی وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر رہا تھا۔ حشمت نے طیش میں آکر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور کہا "یہ شادی نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ کم از کم میرے جیتے جی۔"

شہزاد تھپڑ کھا کر ایک طرف جھک گیا۔ پھر وہ [illegible] اور باپ کو تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ زاہدہ بیگم نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گریہ کرتے ہوئے بولی "بیٹا۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں" وہ پھنکارا اور بائیک لے کر باہر نکل گیا۔ اس پر بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔ ماں پیچھے دوڑی اور رو رو کر رکنے کی فریادیں کرتی رہی لیکن شہزاد پر کچھ اثر نہ ہوا۔

شہزاد ہوا سے باتیں کرتا گڑھی شاہو پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ انکل کی ٹویوٹا کیرولا گاڑی پورچ سے باہر کھڑی تھی۔ انکل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے اور پچھلی نشست پر آنٹی اور گل بیٹھے تھے۔ اس نے بائیک کار کے پاس کھڑی کردی۔

الجھے الجھے بال اور پریشان چہرے میں شہزاد کو دیکھ کر عظمت فوراً گاڑی سے باہر نکلے۔ اس کے ساتھ ہی نیلم اور گل بھی کار سے باہر آگئے۔

عظمت نے متحیر ہو کر پوچھا "بیٹے۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تمہارا مسکراتا چہرہ کملایا ہوا کیوں ہے... آج میں نے تمہیں پہلی دفعہ پژمردہ دیکھا ہے ورنہ تمہارے چہرے پر ہمیشہ پھول کھلے رہتے ہیں کیا بات ہے بیٹا۔"

"انکل۔ ہمارے گھر میں طوفان آگیا ہے۔ طوفان' اس لئے میں گھر چھوڑ کر آگیا ہوں۔"

"لیکن بیٹا۔ تم نے گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ تم نے گھر چھوڑ کر والدین کے نازک سے دلوں کو کرچی کرچی کر دیا ہے۔"

"انکل۔ میں مجبور تھا۔ نہ جانے ڈیڈ نے کیوں گل سے میری شادی کرنے سے انکار کردیا۔ نہ جانے کیوں انہیں گل پسند نہیں آئی۔ نہیں تو رات دن انہوں نے میری اور گل کی منگنی کی رٹ لگا رکھی تھی۔ پھر انہیں گل کیوں پسند نہیں آئی؟ گل تو لاکھوں میں ایک ہے۔"

"لیکن تم نے گھر کیوں چھوڑا؟"

"جب ڈیڈ نے گل کے ساتھ میری شادی سے انکار کردیا۔ تو نہ جانے کیوں میں لال سرخ ہو گیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے بلا سوچ سمجھے کہہ دیا... میں شادی کروں گا' ضرور کروں گا' مجھے کوئی مائی کا لال شادی کرنے سے نہیں روک سکتا۔"

اور پھر ڈیڈ نے زور سے میرے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔ اور میں غصے میں لال پیلا ہو کر گھر چھوڑ کر آپ کے پاس آگیا۔ جب کہ میری ماں فریادیں کرتی رہی' بیٹا گھر چھوڑ کر نہ جاؤ۔ بیٹا نہ جاؤ' تمہارے بغیر تمہاری ماں مر جائے گی۔ مر جائے گی۔"

"بیٹا۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے ماں باپ کا مان توڑ دیا ہے۔ تم نے ان کے پھول نما دلوں کو پاؤں کے نیچے مسل دیا ہے" عظمت نے افسردہ لہجے میں کہا۔

عظمت نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا "وہ تو مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ وہ تو مجھے عرصہ دراز کے بعد دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ انہیں غصے میں بپھر جانے کا حق بھی تھا۔ ان کے ساتھ ماضی میں ہم نے سلوک ہی ناروا کیا تھا۔ لیکن تمہاری شادی تو ضرور ہوگی۔ ان کا غصہ جلد رفو چکر ہو جائے گا۔ تو وہ ہمیں معاف کردیں گے....."

چھوٹوں سے تو اکثر غلطیاں ہو جاتی ہیں اور بڑے معاف کر دیتے ہیں۔ حشمت بھی بہت بڑے دل کے مالک ہیں۔ وہ ہمیں ضرور معاف کردیں گے۔ ضرور معاف کردیں گے۔"

"انکل۔ کیا آپ ڈیڈی کو پہلے سے جانتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی ان کو کوئی دکھ و صدمہ پہنچایا ہے۔ ذرا کھل کر بات کریں۔ پلیز انکل" شہزاد نے اداس ہو کر پوچھا۔

"بیٹا۔ حشمت میرے بڑے بھائی ہیں۔"

"آ... تو آپ میرے سگے چچا ہیں" شہزاد خوش ہو کر انکل کے گلے لگ گیا۔

گل بکاؤلی جو اس وقت تک تایا جان اور تائی جان کے گھر آنے اور روٹھ کر جانے کا

قصہ سمجھ نہ پائی تھی۔ عقدہ کھل جانے پر فرطِ مسرت سے اچھلی اور اس نے پیچھے سے ابو کی کمر میں بانہیں ڈال دیں۔ اور خوشی خوشی بولی "ابو۔ جب تایا جان برسوں کے بعد آپ سے ملے تو وہ خوش ہونے کے بجائے آپ سے ناراض ہو گئے۔ ضرور آپ نے انہیں گہرا زخم لگایا ہو گا جو ابھی تک مندمل نہ ہو سکا۔"

"بیٹی۔ باتوں ہی باتوں میں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ ہمیں جلدی سے حشمت بھیا کے گھر پہنچنا ہے۔ تم دونوں پہلے مجھے بانہوں کے ہالے سے آزاد کرو اور جلدی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔ میں کار میں تم کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"او کے ڈیڈ۔"

"شہزاد بیٹا۔ تم بھی بائیک یہاں ہی لاک کر دو اور ہمارے ساتھ کار میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہارے ہی گھر جا رہے ہیں تاکہ بھائی صاحب کو منا سکیں۔"

شہزاد بلا حیل و حجت کار میں بیٹھ گیا۔ عظمت نے کار اسٹارٹ کی اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ کار فراٹے بھرنے لگی۔

عظمت نے دل گرفتہ ہو کر اپنے خشک لبوں کو کھولا۔ "بیٹی گل۔ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن گیا۔ مجھے بڑا آدمی بنانے میں بلاشبہ بڑے بھائی حشمت کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے خود اسکول چھوڑ دیا اور محنت مزدوری کرنے لگے۔ جو ان کے ایثار و قربانی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ انہوں نے مجھے خوب افورڈ کیا۔ ماں باپ کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور تیری پھوپی انجمن کا گھر بھی آباد کیا۔

جبکہ میں نے والدین کی مرضی کے خلاف تمہاری ماں سے شادی کر لی اور ان سے قطع تعلقات کر لئے۔"

پھر عظمت چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سکوت کو توڑتے ہوئے بولا "ایک دفعہ تمہارے دادا و دادی ہمارے گھر آئے۔ اس وقت تو اس دنیا میں نہیں آئی تھی۔ تو تیری ماں نے ظاہری نمود و نمائش کی خاطر جان پہچان والوں کو جتایا کہ یہ ہمارے نوکر ہیں ' پھر ایک دفعہ تمہارے دادا کے کہنے پر ہی تمہارے تایا حشمت ہمارے گھر میں آئے۔ اس وقت ہم آصف

پلازہ گلشن اقبال میں رہتے تھے۔ تو ہم نے تمہارے تایا کو بھی نوکر ہی شو کیا اور انہیں ٹھہرایا بھی سرونٹ کوارٹر میں ہی۔ انہوں نے صرف ایک رات بسر کی اور چلے گئے۔ اس دن کے بعد آج کے دن تمہارے تایا ہمارے گھر آئے ہیں۔

حیف صد حیف تیرے دادا و دادی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تب بھی میں اپنے آبائی شہر نہ گیا۔ ان کے مرنے کے بہت عرصہ بعد گیا تھا اور تمام جائداد بیچ آیا تھا۔ اس وقت مجھے اڑوس پڑوس سے معلوم ہوا تھا کہ حشمت بھائی باپ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا اور کویت میں نوکری کر رہا تھا۔"

"ڈیڈی۔ آپ کو اماں نے بھی نہیں سمجھایا۔"

عظمت کے جواب دینے سے پہلے نیلم روہانسی ہو کر بولی "بیٹی۔ جب یہ کارستانی ہی میری تھی تو میں تمہارے باپ کو کیا سمجھاتی۔ ان کو تو غلط راہ پر لگایا ہی میں نے تھا۔ میں اپنے آپ کو امیر باپ کی بیٹی سمجھتی تھی۔ مجھ پر امارت کا بھوت سوار تھا۔ جبکہ میرے سسرال والے غریب تھے۔ اس لئے میں نے ان کو منہ نہ لگایا جو ہمارے فرسودہ معاشرے کے لئے ایک کلنک کا ٹیکہ ہے۔ ہم جیسے امیر لوگوں کے لئے ایک تازیانہ ہے جو امارت کی شیخی میں اپنے خونی رشتہ داروں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔"

"میں کتنی گناہ گار ہوں کہ جب تمہارے دادا مرحوم ہمارے گھر میں آئے تھے تو میں نے نفرت بھرے لہجے میں ان سے کہا تھا "آپ کے کپڑوں سے بو آتی ہے۔"

انہوں نے ہنس کر جواب دیا تھا "بیٹی۔ شاید میرے کپڑے دھونے والے ہیں۔ انہیں دھو دو تو بو ختم ہو جائے گی" تو میں قہقہہ بکھیر کر کمرے میں چلی گئی تھی "میں اور کپڑے دھوؤں ۔۔۔ وہ بھی ایک نوکر کے۔" لیکن وہ پھر بھی ہنس دیے تھے۔

"بیٹی اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا ۔۔۔ معاف نہیں کرے گا" نیلم نے رو رو کر کہا۔

"اماں رو مت۔ ابھی تمہارے رونے سے تمہارے گناہ معاف تو نہیں ہو جائیں گے ۔۔۔ تایا جان سے تو اپنے کئے کی معافی تو مانگو گی ہی ۔۔۔ دادا جان کے حصے کی معافی بھی تایا جان سے مانگ لینا۔" گل نے افسردگی میں ماں کو سمجھایا۔

اچانک گل نے شہزاد کو سسکیاں بھرتے دیکھا تو گویا ہوئی "ارے شہزاد۔ تم کیوں سسکیاں بھر رہے ہو؟"

"میں پاپی ہوں۔ میں نے فرشتہ صفت باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس باپ کا دل دکھایا ہے کہ جنھوں نے مجھے پھول کی طرح پالا پوسا۔ میری ہر جائز و ناجائز خواہش کو مانا۔ مجھے کبھی ڈانٹا تک نہیں۔ مجھے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا۔"

افوہ۔ ابو زندگی میں ایک ہی بار غصے میں آئے اور میں نے بھی انہیں ترکی بہ ترکی جواب دے دیا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ بدنصیب۔"

"شہزاد۔ مت آہیں بھرو۔ ابو کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لینا۔ وہ معاف کر دیں گے۔" گل نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

شہزاد چپ ہو گیا اور گاڑی میں سناٹا چھا گیا۔ سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں اور کار تیزی سے اپنی مسافت طے کرتی رہی۔

O☆O

شہزاد کے گھر سے چلے جانے کے بعد حشمت اور زبیدہ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ زاہدہ خوب چیخی چلائی اور بیٹے کو نہ جانے کی فریاد کی لیکن وہ چلا گیا تو وہ دہلیز کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ رو دی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی۔

کافی دیر کے بعد وہ اٹھی۔ لٹی لٹی سی اندر آئی اور اپنے سرتاج کے سرہانے بیٹھ گئی جو چت لیٹے تھے اور چھت کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے' وہ سر جھکا کر رونے لگے۔

زاہدہ کی آہ و فغاں پر حشمت سوچوں کے دھارے سے باہر نکل آیا۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے اپنی بیوی کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اور اپنی ویران آنکھوں میں دو موٹے موٹے شبنمی قطرے سجائے گویا ہوا "زاہدہ رانی! گریہ وزاری مت کرو' رونے دھونے سے کچھ نہیں ملے گا۔"

پھر وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگا "تم پیکر عظمت' مجسم صداقت' مجسمہ عفت' سراپا انسیت اور سراپا عصمت ہو۔ ہم اپنی شادی کی سلور جوبلی شان و شوکت سے

منا چکے ہیں۔ تم نے ان گزرے سالوں میں میرا ہر لحاظ سے خیال رکھا۔ میرے دامن کو خوشیوں سے بھرے رکھا۔ اور میں نے بھی تمہیں پھولوں کی سیج پر سجائے رکھا۔ پیار..... پیار سے اپنے من کے اندر بسائے رکھا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ اور یقیناً تجھے بھی مجھ سے کوئی گلہ نہیں ہو گا..."

لیکن میں آج تم سے ایک راز کی بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری خاطر سچ سچ بتا دو گی۔ نہ شرماؤ گی' نہ چھپاؤ گی....

اگر تم شہزاد کا ہاتھ نہ پکڑتیں تو وہ ایک زوردار طمانچہ ہوتا باپ کے منہ پر۔ دنیا کے لئے تماشا ہوتا اور غیرت مند باپ کے لئے ڈوب مرنے کا مقام۔ غوطے دکھ کے سمندر میں تو اب بھی میں کھا رہا ہوں لیکن ڈوبا نہیں....

شہزاد کے مذموم فعل نے مجھے وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں... کہ شہزاد... میرا.... خون... نہیں.... ہے۔ کیا... میں تجھ سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کس.... کا خون ہے؟"

اس کی زبان لڑکھڑا چکی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا لیکن جب زاہدہ نے چپ سادھے رکھی اور جواب نہ دیا تو حشمت نے اس کا دایاں مرمریں ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور بڑی مشکل سے لبوں کو کھولا "زاہدہ۔ تمہیں اپنے سرتاج کے سر کی قسم۔ میرے سوال کا جواب دو۔ پلیز زاہدہ۔"

حشمت کا سوال دلخراش تھا۔ بلاشبہ وہ سوال سنتے ہی اس کا کلیجہ چھلنی ہو کر منہ میں آ گیا تھا۔ زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ اس کا رواں رواں غم میں رو رہا تھا۔

اس کا سر جھک گیا اور لرزتے ہونٹوں سے اس نے اپنی داستان غم یوں بیان کی۔

"یارھویں جماعت کے سالانہ امتحان قریب تھے۔ میں اپنے پڑوسی کلاس فیلو سے فزکس کے نوٹس لینے گئی۔ وہ اور میں پہلے بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ہمارے والدین کو ایک دوسرے سے ملنے اور پڑھائی میں ایک دوسرے کی مدد کرنے پر رتی بھر اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی ہم دونوں کا شمار فطین و حفاظ اسٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ کلاس میں کبھی وہ

فرسٹ آجاتا تھا اور کبھی میں۔ دسویں کے سالانہ امتحان میں میں فرسٹ آئی تھی اور اس سے پورے ۲۰ نمبر میں نے زیادہ لئے تھے۔ بارہویں جماعت کے سالانہ امتحان میں وہ سوچتا تھا کہ وہ مجھ سے سبقت لے جائے گا۔ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ دن رات پڑھتا رہتا تھا۔ میں بھی پڑھتی تھی لیکن میں گھر کا کام کاج بھی کرتی تھی۔ باوجود اس کے مجھے بھی اپنی محنت اور خدا کی رحمت پر کامل بھروسہ تھا۔

یہاں میں اس بات کا حوالہ دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ ہمارا کالج ایک تھا لیکن گرلز اور بوائز ونگ الگ الگ تھے۔ لیکن نتیجہ کا شمار سائنس اور آرٹس مضامین کے حساب سے ہوتا تھا۔ نہ کہ صنف کے لحاظ سے۔

مثلاً بارہویں جماعت کے امتحان کا نتیجہ نکلے گا تو سائنس گروپ میں فرسٹ لڑکی بھی ہو سکتی تھی اور لڑکا بھی۔

تو ہاں میں بات کر رہی تھی نوٹس لینے کی۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھی تو باب وا ہوا۔ ندیم سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "آنٹی۔ کہاں ہیں؟"

"امی جان۔ باورچی خانے میں ہیں۔ ہانڈی پکا رہی ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور حسب معمول مجھے اندر آنے کے لئے کہا۔

میں نے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ہی پوچھا "ندیم۔ مجھے آج کے لئے فزکس کے نوٹس دو۔ میں شام کو لوٹا دوں گی۔"

"اچھا۔ میں ابھی اپنے کمرے سے نوٹس لے آتا ہوں" اس نے پہلی بار چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کی آنکھوں کی چمک کو برداشت نہ کر سکی اور میں نے اپنی آنکھوں کو جھکا لیا۔ اس روز اس کی بلوری آنکھوں میں شیطانیت رقص کر رہی تھی۔ نہ جانے اس روز اسے کیا ہو گیا تھا۔ یا بنیادی طور پر وہ شیطان ہی تھا لیکن اس سے قبل اسے اپنے ہاتھ دکھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ تنہائی نہیں ملی تھی۔

وہ مجھے چپ چاپ دیکھ کر اندر نہ گیا بلکہ صوفے کے کونے پر میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھے بانہوں میں لے کر بولا "جان من۔ آج تو ایسی لگ رہی ہو۔ جیسے پری، آکاش سے اتری ہوئی

اپسرا۔ آج تو تجھ سے خوب صورت کھیل کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

میں اس کی بہکی بہکی باتیں سن کر لرز اٹھی۔ میں گھبرا کر بول اٹھی "چچی جان، چچی جان۔"

"تمہاری چچی آج اسپتال گئی ہیں۔ وہ دو گھنٹے بعد واپس آئیں گی" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر وہ درندہ بن گیا۔ اس نے مجھے اپنی آہنی پنجوں میں جکڑ لیا۔ پھر مجھے دبوچا، میں زخمی پرندے کی طرح پھڑکتی رہی، لیکن بے سود، پھر اپنے پر کٹا کر واپس آ گئی۔

امتحان آئے اور گزر گئے اچھے امتحان ہوئے۔

ایک منحوس روز میں امی کے ساتھ ناشتا کر رہی تھی کہ اچانک میرا دل متلانے لگا۔ میں نے امی جان سے اچار مانگا۔ انہوں نے مجھے اچار دیا۔ لیکن اچار کھانے سے بھی میرا دل ٹھیک نہ ہوا تو میں قے کرنے کے لئے باتھ روم بھاگی اور ابکایاں کرنے لگی۔

مجھے دیکھ کر ماں پریشان ہو گئی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر پوچھا۔ "بیٹی۔ میرے من کے مندر میں خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کہیں تمہیں کسی کالے ناگ نے ڈس تو نہیں لیا۔"

"ہاں۔۔۔ ماں، ہاں" میں نے اثبات میں جواب دیا اور اپنی دکھوں بھری کہانی سنا دی۔

میری ماں کے سینے میں زہر بھرا تیر لگا تو وہ سینے کو سہلانے کے لئے اپنا سینہ زور زور سے پیٹنے لگی۔

اپنے سینے کو چھوڑا تو مجھے پکڑ لیا اور مجھے دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔ میں سر جھکا کر مار کھاتی رہی۔ آدم زاد کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتتی رہی۔ جب ماں مارتے مارتے تھک گئی اور ہانپنے لگی تو اس نے مجھے چھوڑ دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور سارا دن روتی رہی۔

ابو کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہاتھ منہ دھو لئے۔

دوسرے روز میری ماں نے ندیم کی ماں کو اپنی دلگداز بپتا سنائی۔ اس نے بھی میری ماں کی طرح اپنے خاوند سے مشورہ کیا اور شادی پر راضی ہو گئے لیکن جب ندیم کو پتا چلا تو اس نے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ انکار ہی نہیں کیا بلکہ مجھ پر دروغ گوئی کا الزام بھی لگا دیا۔ الٹا

چور کوتوال کو ڈانٹے "زاہدہ جھوٹ بولتی ہے۔ سراسر مجھ پر تہمت لگاتی ہے۔"

میں نے سنا تو سر پیٹ لیا اور رب ذوالجلال سے رو رو کر فریاد کی۔ اللہ نے میری سن لی۔ دروغ برگردن راوی کے مصداق دوسرے روز اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ اسے لقوی ہو گیا۔

اس کے بعد میرے غم زدہ والدین کے لئے صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کہ وہ ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے چوری چوری تمام پرائیویٹ ڈاکٹروں سے میرا علاج کرانے کی تگ و دو کی لیکن کسی نے بھی میرا علاج نہ کیا۔ کیونکہ قطر میں ڈاکٹروں کے لئے میرے قبیح فعل کا علاج ممنوع اور قابل سزا تھا۔

میری امی اور ابو ہمت ہار گئے۔ ان کی خوشیوں کا چراغ بجھ گیا تو انہوں نے مالک حقیقی کے در پر دستک دی۔ مستجب الدعوات کی بارگاہ میں ان کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔ حشمت کے روپ میں انہیں جگنو مل گیا۔ جس نے ان کے آنگن میں امید فرحت کا اجالا بکھیر دیا۔"

زاہدہ اپنی دلخراش کہانی سنانے کے بعد اپنے رنجور محبوب کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ حشمت نے اسے چپ نہ کرایا۔ برعکس اس کے اس نے اپنی غم ناک داستان کے پٹ کھول دیئے۔ میں جب پیدا ہوا تو ماں نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔

"میرے آنگن میں گلاب کا پھول کھلا ہے۔ گلاب کا پھول' یہ مجھے نانی نے بتایا تھا۔ لیکن میں گلاب کا پھول کیسے بن سکتا تھا۔ میں تو کنول تھا۔ غریب کے گھر جو پیدا ہوا تھا۔

حیف صد حیف میری پیدائش کے دو ہی دن بعد میری ماں بیاری ماں مر گئی۔ تو پھر تو میں سچ مچ کنول بن گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ وقت کے ساتھ ہی میں بھی بڑا ہوتا رہا۔ اسکول میں داخل ہوا۔ اساتذہ کرام کی آنکھوں کا تارا بنا..... بارہویں جماعت کا امتحان نہ دے سکا۔ پھر مزدوری کرنے لگا تو مستریوں کا چہیتا مزدور بن گیا۔ میں نے بہت محنت کی' ماں باپ کی خدمت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ لیکن پھر بھی ان کے دلوں کا گلاب نہ بن سکا..... میں کنول ہی رہا۔ الاقارب کالعقارب کے مصداق اپنے ہی غیر ہو گئے۔ انہوں نے جینا دوبھر کر دیا تو اپنی

زندگی سنوارنے کے لئے کویت آ گیا۔ کویت سے قطر آیا۔ قطر آ کر میرے دل کا کنول کھل گیا۔ صحرا جہاں باد صرصر چلتی ہے۔ جہاں چلچلاتی دھوپ کا راج ہوتا ہے۔ وہاں آ کر مجھ پر رت بہار آ گئی۔ میں کھل گیا۔ گویا کنول صحرا میں آ کر کھل گیا۔ صحرا میں کنول کھل اٹھا۔

کنول صحرا میں آ کر ایسا کھلا کہ اسے خوب صورت و حسین گلشن آرا مل گئی۔ جس نے تن من دھن سے میری آبیاری کی تو میں اپنے آپ کو گلاب کا پھول سمجھنے لگا۔ دنیا کا خوش نصیب فرد۔ مقدر کا سکندر! لیکن امروز مجھ پر اس عنصر کا عقدہ کھلا کہ قطر آ کر میں جو سمجھ بیٹھا تھا کہ میری تقدیر جاگ پڑی ہے' وہ میری خام خیالی تھی' وہ ایک سراب تھا...... ایک سراب دکھاوے میں تو خوش نصیب تھا لیکن درحقیقت وہ میرا نصیب نہیں تھا۔ وہ تو زاہدہ اور شہزاد کا نصیب تھا۔ جنہوں نے میرے طفیل زندگی کی خوشیوں کو گلے لگایا تھا۔ جن کا درخشاں مستقبل میرے ہاتھوں سے بن گیا تھا۔ تقدیر تو زاہدہ کی اچھی ہے کہ جس کا گھر ندیم نے اجاڑ دیا تھا لیکن میں نے آباد کر دیا۔ وہ زندگی بھر ہنستی مسکراتی رہی۔ مقدر کا سکندر تو شہزاد ہے کہ جس کو پیدا ہوتے ہی کوڑا کرکٹ میں پھینکا جانا تھا لیکن وہ محل میں پرورش پانے لگا.....

قسمت تو اوپر والا بناتا ہے۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ قسمت کو کوئی انسان بدل نہیں سکتا۔ تدبیر بھی..... انسان تدبیر کرتا ہے لیکن تقدیر اس پر ہنستی ہے۔

میں تو خواہ مخواہ اپنے سسر کے عیب نکالتا رہتا تھا کہ وہ لکھ پتی ہونے کے باوجود کھاتا پیتا نہیں تھا۔ اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کرتا تھا..... نہ مناسب کھاتا اور نہ اچھے کپڑے پہنتا.....

میں ہوتق کیا سمجھتا کہ جب رب العزت نے ان کی قسمت میں اچھا کھانا پینا لکھا ہی نہیں تھا تو وہ کیسے اچھا کھانا کھاتے اور کیوں اچھے اچھے کپڑے پہنتے..... ان کی قسمت میں تو اللہ نے صرف اور صرف دولت ہی لکھی تھی۔ اور دولت ہی دولت فقط ان کا بھی مطمع نظر تھی۔"

حشمت تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گیا۔ زاہدہ جو اپنے زخمی شوہر کی زہریلی مگر حقیقی باتیں سن کر غموں دکھوں کی آگ میں جل جل کر بھسم ہو رہی تھی اور اپنے جسم کو سہارنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو حرکت میں لا کر اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔

چند لمحات کے سکوت کے بعد حشمت نے لرزتے ہونٹوں سے کہا۔ "قسمت تو عظمت بھائی کی اچھی ہے کہ جو قارون کے خزانے کے سائے میں پلا۔ شادی بھی مالدار اور گرہستن حورا سے ہوئی... باپ دادا کی جائداد کا اکیلا وارث بنا.... اور اب میری اور زاہدہ کی تمام پونجی کا مالک ہوگا۔ اس لئے کہ شہزاد اس کا داماد ہوگا۔

میں تو کنول کا پھول ہوں۔ جو گردوپیش کے سموم اور خونی ستم گاروں کے ظلم کے حصار میں جوان ہوا۔ اگرچہ میں نے زمانے کی تیز و تند ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن میں گلاب کا پھول نہ بن سکا۔

اگر میں نے دنیا میں گلاب کا پھول بننا ہوتا تو میں امیر و کبیر گھر میں پیدا ہوتا۔ اگر غریب گھر میں پیدا ہو گیا تھا تو پھر میری پیدائش کے دو دن بعد ماں نہ مرتی۔ آہ! میں غلیظ مٹی میں اگا تھا اور اب مٹی میں ملنے کے لئے رخت سفر باندھتا ہوں۔ سنا زاہدہ تم نے۔"

"ارے بھاگوان بولتی کیوں نہیں.... اری تم تو برف کی بن گئی ہو۔ برف.... تم تو اب بھی مجھ سے سبقت لے گئی ہو.... نصیبوں والی جو ہو۔ اچھا میں بھی آتا ہوں... لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ۔"

(ختم شد)